بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمارہ فروری 2024ء

ادبی سلسلہ نمبر 7

کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں
شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

امیر مینائی

شمارہ فروری 2024ء

ادبی سلسلہ نمبر 7

انچارج	ثنا اکرم ملھی
چیف ایڈیٹر	تنہاؔ لائلپوری

رابطے کا ذریعہ:

tanhalyallpuri@gmail.com

0305-8545555

فہرست

فہرست

(حصہ نثر)

اداریہ

ثنا اکرم ملہی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم، اللہ لا الہ الا ھو الحیی القیوم۔ اللھم صلِ علیٰ محمد و آل محمد وبارک وسلم تسلیما۔ خشک سردی، چند دنوں کا موسم لا مکاں کے لیے طویل صدیوں جیسی مسافت لیے سمٹ رہا ہے، بارش کے انتظار نے ہر زبان پہ نافع بارش کی پکار جاری کر رکھی ہے۔ ایک طرف موسم کی شدید حالت اور دوسری طرف جمہوری نظام نے اپنے کھیل کا سکہ فرمایا ہوا ہے۔ قارئین کرام! تو شروع ہے آپ کے رعایا کی حیثیت سے حاکم کے تقرر کا وہ خاص مہینہ جس میں آپ کا انتخاب ہی آپ کو ایک ایسا حاکم دے گا جس کا تحریری منشور نہ تو آپ نے کبھی مانگا، اور نہ ہی کسی منشور کو لے کر کوئی راہنما آپ کے سامنے نفاذ کتب اللہ کے لیے سامنے آیا ہے۔ اسلامِ کامل نے ایسا ضابطۂ حیات دیا جس میں دنیا کا کوئی بھی دوسرا ضابطہ پیوست نہیں ہو سکتا، یہ ایک خالص نظام ہے۔ جس نے اس کے اخلاص کو اپنا لیا وہ سرخرو ہو گیا اور جس نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی اس کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ قارئین کرام اگر اسلامی سیاسی نظام کو زیرِ نگاہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کسی بھی خلیفۂ وقت نے خود کو خلافت کے عہدے کے لیے پیش نہیں کیا بلکہ احباب دانش و حکمت نے اپنی رعایا کے لیے ایسے خاص انسان کو اپنے لیے حاکم مقرر کیا جس کے متعلق انہیں خیال گزرا کہ وہ ہم سب میں اللہ تعالیٰ کے نظام کو بہترین طریقے سے لاگو کر سکتا ہے۔

پھر ایسے راہنماؤں سے جو فتوحات اور جو خوشحالی عصر و زماں نے دیکھی وہ تاریخ کا بہترین وقت ثابت ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم لا الہ الا اللہ کی سر زمین پہ رہتے ہوئے اس لا الہ الااللہ کے نظام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کس عقل و فہم پہ اتارتے ہیں۔ اگر ہم اسلام کو پہلی ترجیح نہیں بناتے تو پھر ہمارے سامنے چند ایک نامی گرامی تحریکیں ہیں جن میں عوامی پہچان بننے والے باشندے نہ تو اسلام سے خود واقف ہیں اور نہ ہی وہ اسلام کا نظام لانا چاہتے ہیں، اقتدار کے حرص نے ان کو رب کے ہر حکم کے سامنے صم بکم عمی بنا رکھا ہے۔ آپ اگر ووٹ دے کر ایسے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں تو یہ آپ کا اپنا انتخاب ہے اگلے کئی سال حاکم وقت کو پھر گالم گلوچ کرنے سے اپنا معاشرتی رویہ برا کرنے سوا کچھ حاصل نہیں۔ البتہ بحیثیت امتِ محمدیہ آپ سب خود کو جگائیے، اپنوں کو ساتھ لے کر اسلام کو جانیں، اسلام کو پہچانیں اور جمہوری نظام سے لڑیں، اللہ کا نظام لانے کی پہلی کوشش کریں، یاد رکھیں ہر شب کے بعد سحر ہے، ہر اندھیرے کی انتہا کے بعد اجالا ہے اور ہر ظلم کے بعد قطع ظلم ہے۔ یہ جبریت و ظلمت کا دور جلد ختم ہو جائے گا اور خلافت کی سحر نمودار ہو گی، کیا ہی اچھا ہو اگر اس سحر کو لانے کے کے لیے ہم اور تم پیش پیش ہو جائیں۔

قارئین آپ کا اپنا میگزین حاضر ہے اسے پڑھیے، لکھیے دوسروں تک پہنچایئے تاکہ کوئی قاری رہ نہ جائے۔ مطالعہ کے بعد اپنے تبصرے سے ہمارے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی ضرور کریں۔

لکھیں، پڑھیں، سلامت رہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی ہو۔

والسلام
ادارہ

حمد

امجدؔ اسلام امجدؔ

بنتے ہیں ہر سوال کے پیکر نئے نئے
کھلتے ہیں پھول ذہن میں اکثر نئے نئے

کس نے سیاہ رات کو تارے عطا کیے
پھر ان میں رکھ دیے کئی چکر نئے نئے

کرتا ہے کون پھول کو خوشبو سے ہم کنار
رکھتا ہے کون آنکھ میں منظر نئے نئے

کس قاعدے سے پھیلتی جاتی ہے کائنات
ذروں سے نکلے آتے ہیں جوہر نئے نئے

اک کہکشاں کے بعد ہے اک اور کہکشاں
پھر ان کے بعد بھی مہ و اختر نئے نئے

کیونکر یہ شہر لاکھوں برس پانیوں میں تھے
کیسے بنے زمیں پہ سمندر نئے نئے

امجدؔ یہ سب یقین بھی، سارے گمان بھی
سب ہیں اسی جمال کے مظہر نئے نئے

نعت

حمزہ ارشد

ان کی روشن جبیں باخدا نور ہے
میرے آقاﷺ کی اک اک ادا نور ہے

اور کیا چاہیے پھر گواہی تمہیں
خود خدا نے کہا مصطفیٰﷺ نور ہے

میں درِ غیر کی چاکری کیوں کروں
مجھ گنہگار کا آسرا نور ہے

گنبدِ سبز پر اک نظر کیا پڑی
میری آنکھوں میں اب تک بسا نور ہے

عرشِ اعظم پہ جن کو بلایا گیا
عرش بھی بول اٹھا، ہر ادا نور ہے

التجا ہے کہ محشر کے دن ساتھ ہوں
جن کے صدقے یہ ارض و سما نور ہے

ان کے صدقے میں حمزہؔ بنا مدح خواں
آستانے سے ان کے ملا نور ہے

رنگ بدلے زندگی

آمینہ یونس

ان کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ تین دن سے وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر سب کی جان پر بنی ہوئی تھی اور آج ان کا ٹھیک ہو کے گھر آنا، یہ کہنا مناسب ہو گا کہ آنہیں گئے بلکہ لایا گیا تھا کیونکہ چوہدری ذیشان کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ چل کے آتے، جب چوہدری نثار بیٹے کو گھر لے آئے تو گھر والوں نے ان کا استقبال پھولوں سے کیا تھا اور انہیں بہت احتیاط سے لا کے بیڈ پر سلا دیا، ان سب کاموں میں چوہدری نثار پیش پیش تھے۔ ان کو ذیشان سے بہت پیار تھا دوسرا ان کی حالت نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ چھوٹے بڑے سب چوہدری ذیشان کے ارد گرد کھڑے سوال پر سوال کر رہے تھے لیکن ابھی وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

یہ دیکھتے ہوئے چوہدری نثار نے سب کو ڈانٹ دیا، کیا دیکھ نہیں رہے ہو اس کی حالت؟ سوال کسی اور وقت بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ ابھی اس کو آرام کرنے دو، یہ کہہ کے انہوں نے سب پر ایک نظر ڈالی تو سب ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے اور چوہدری نثار ذیشان کے پاس ہی رہے، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی بیٹے سے الگ نہیں ہو رہے تھے۔ سب کی محنت اور محبت تھی کچھ ہی دن میں چوہدری ذیشان بہتر محسوس کر رہے تھے ورنہ ان لوگوں نے مارنے کی کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی تھی انہوں نے آنکھ کھول کے اپنے ارد گرد دیکھا اور یہ دیکھ کر وہ اپنے گھر میں ہیں، اپنے کمرے میں ہیں ایک پر سکون سانس لیا اور اٹھ کے بیٹھ گئے۔ دائیں طرف امی اور بائیں طرف ابو بیٹھے ہوئے تھے۔

امی نے آگے بڑھ کر ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا، بیٹے کی تکلیف پر بے وہ بے اختیار رو دی، چوہدری ذیشان ماں کو تسلی دینے لگے، امی روتی کیوں ہیں؟ میں زندہ سلامت آپ کے سامنے ہوں، امی کہنے لگی، بیٹا میں ان ظلموں کے ظلم پر رو رہی ہوں جو اس وقت پاکستان میں انہوں نے ہر شہری پر مچار کھی ہے۔ یہ تیری میری بات نہیں ہے اب ہر دوسرا گھرانہ اس ظلم کا شکار ہے۔ امی فکر مت کریں ان شاءاللہ یہ ظلم چھٹ جائے گا اور حق کا بول بالا ہو گا، ماں باپ بیٹا یک زبان ہو کر بولے، ان شاءاللہ!

آج رات کو چوہدری نثار بیٹے کو بہتر حالت میں دیکھ کر اپنے کمرے میں سونے گئے تھے، ورنہ وہ کئی دنوں سے ادھر ہی سو رہے تھے۔ آج طبیعت کچھ بہتر تھی اور چوہدری ذیشان کو کمرے میں بیٹھے بیٹھے گھٹن کا احساس ہونے لگا، کئی دن سے وہ گھر والوں کے سخت پہرے میں تھے آج رات سب اپنے اپنے کمروں میں گئے تو رات کو وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر لان میں آ گئے جنوری کی ٹھرٹھراتی سردی نے ان کا استقبال کیا لیکن وہ پہلے سے ہی بچاؤ کا بندوست کیے ہوئے تھے۔ اس لیے تھوڑی سی واک کے بعد ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

آنکھ بند کی تو ماضی کی کتاب کا ورق در ورق میرے سامنے کھلتا گیا اور میں جی سی یونیورسٹی لاہور میں پہنچا جہاں میرا اور میرے دوستوں کی غنڈہ گردي کی داستان ہر زبان پر عام رہتی تھی۔ ایک تو چوہدری کا خون اس پہ جوانی اور اللہ نے چوہدری ذیشان کو حسن کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت مغرور ہوا کرتے تھے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

یونیورسٹی میں ہم سے پروفیسر بھی دب کے رہتے اور ہم اپنی ہی من مانی میں رہتے یونیورسٹی میں بہت سی لڑکیوں سے دوستی بھی تھی اور بہت کو میں نظرانداز بھی کرتا، لیکن پہلی نظر میں ہی اس لڑکی کو میں نظرانداز نہ کر سکا، جو اپنی دوستوں کے ساتھ کیفے کی طرف جارہی تھی۔ میری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا اور ایک دن اس سے اظہارِ محبت بھی کر بیٹھا۔

جب تعارف ہوا تو پتہ چلا ہما ہمارے ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کی بیٹی ہے جن کے ساتھ ہماری تین نسلوں سے دشمنی چلتی آرہی تھی لیکن محبت یہ سب کہاں دیکھتی ہے۔ جب کرنے پر آتی ہے تو اپنا آپ منوا کے رہتی ہے سو ہم دونوں بھی نتائج سے بے پرواہو کر اس راہ پر قدم رکھ بیٹھے۔ جس کی منزل ہمشیہ بے نشاں رہتی تھی۔ ہما سے محبت کیا ہوئی تھی میں ہواؤں میں اڑنا لگا تھا۔

دنیا اس سے پہلے کبھی حسین نہیں لگی تھی۔ گھٹ گھٹ کے رہنا، مخالف پارٹی کو کیسے ہرانا ہے۔ گولی کہاں اور کس پر چلانے ہے؟ کبھی باپ، چچا سے ڈانٹ پڑھنے کا ڈر تو کبھی ماں کی جھڑکیوں سے خوف لیکن محبت نامی چیز نے یہ سب بھلا دیا تھا اور یاد تھی تو صرف ہما کی حسین اور دل فریب مسکراہٹ، اور ہما کو حاصل کرنے کے لیے میں دشمن سے ٹکرانے کو بھی تیار تھا ہما مجھ سے کہتی، ذیشان محبت تو ہم کر بیٹھے ہیں۔ لیکن ہمارا ملنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے اور میں اس کو تسلی دیتا، فکر مت کرو تم میں اپنے گھر والوں کو منا لو گا اور ہم تین نسلوں پر محیط اس دشمنی کو اس مظبوط رشتے میں باندھ کر ہمیشہ کے لیے ختم کریں گے ان شاءاللہ! ہما کہنے لگتی، پتہ نہیں یہ خواب خواب ہی نہ رہے۔

پلیز ہما تھوڑی دیر کے لیے اس خوف کو ہمارے درمیان نہ لاؤ، ان خوش کن لمحات کو محسوس کرنے دو۔ آئندہ کے خوف میں ابھی کی خوشی کو برباد تو نا کریں وہ مسکرانے لگی، مجھے اور ہما کو مستقبل کے خواب بنتے یونیورسٹی کے دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔

جب والدین نے میری شادی کا موضوع چھیڑا تو میں نے ڈرتے ڈرتے ہما کا نام بتا دیا، پہلے والدین مجھ سے بہت ناراض ہوئے ایسا نہیں ہو سکتا کیسے ہم ایک دشمن سے رشتہ جوڑ سکتے ہیں؟ ہم ان کے گھر رشتہ لے کر جائیں یہ ہماری انا کیسے گوارا کرے گی، لیکن میری حالت کے آگے ان کی ایک نا چلی، میرے گھر والوں نے ان کے گھر رشتے کا پیغام بھیج دیا، مگر چوہدری سرور کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھے۔ میں اور ہما کی معصوم محبت بھی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئی کیونکہ محبت کو ازل سے قتل کرتے آئے ہیں اور کبھی بھی کسی نے بھی عدالت میں یہ مقدمہ نہیں جیتا تھا۔ امی کہنے لگی، بیٹا اب تم شادی کر لو میں کوئی لڑکی دیکھ لوں اب تمہاری شادی کی عمر ہے۔ نہیں امی میں نے اب کبھی شادی نہیں کرنی، آپ باقی بہن بھائیوں کی شادی کر دیں۔

ابھی میں نے پڑھنا ہے آگے ان شاءاللہ وکالت پڑھوں گا آئے دن ہمارا سیاست سے تعلق ہے تو گھر میں ایک وکیل کا ہونا ضروری ہے۔ میں نے امی کی بات پر بات کو مزاحیہ رنگ دیتے ہوئے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو امی چپ ہو گئی، میری وکالت پڑھنے کے دوران جب چھٹی کے دن شہر سے گاؤں جاتے ہوئے مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو میں شدید زخمی ہوا تھا اس کی وجہ سے میں کومے میں چلا گیا تھا 45 دن بعد مجھے ہوش آیا، شاید اللہ نے ابھی مجھے زندہ رکھنا تھا۔

میں ہوش کی دنیا میں واپس آیا تو اس دشمنِ جاں کا ایک کارڈ میرا منتظر تھا۔ میرے صحت یابی کی دعا کے ساتھ اپنے شادی کی خبر بھی دی تھی ایک لمحہ کے لیے دنیا میرے نظروں میں تاریک ہو گئی تھی۔ دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا، اب اللہ کے کرم سے میں بالکل صحت یاب ہو گیا تھا اور میں نے وکالت کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس دوران میرے بھائیوں اور بہنوں کی شادی ہو گئی اور سب خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ میں بھی ابو، تایا اور چچا کے ساتھ دشمنوں سے دشمنی بھی نبھاتا اور جرگا بھی دیکھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ بہت سی برائیاں جو چوہدریوں کا خاصہ تھیں مجھ میں بہ اتم موجود ہیں۔ میں سفاک بھی مشہور تھا۔

ان سب کے ساتھ میں نے وکالت کی پریکٹس بھی جاری رکھی، اللہ کے فضل سے میری محنت رنگ لے آئی، جو بھی کیس میں ہاتھ میں لیتا جیت جاتا، آہستہ آہستہ میری شہرت بڑھ گئی، اب جو کیس میں ہاتھ میں لیتا تھا وہ جیت کی ضمانت بن جاتا۔ یہ مجھ پر میرے رب کا خاص کرم تھا میں کیس پر محنت بھی زیادہ کرتا تھا۔ ایک کیس جو میں بھول نہیں سکا، قتل کا تھا جس پر قتل کا الزام تھا وہ بے گناہ تھا لیکن پھنسانے والوں نے اسے بری طرح پھنسایا تھا۔ اس پر مجھے محنت بھی بہت کرنا پڑی اور میں اسے بری کروانے میں کامیاب بھی ہو گیا، اس کی خوشی مجھے آج بھی خوش کرتی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو کبھی کبھار محسوس کریں تو دل پر سکون سا ہو جاتا ہے کیونکہ دشمنوں سے لڑتے سیاست کی گھما گھمی میں غرق دنیا کو حاصل کرنے کی دھن میں ہم انسان خود کو کہیں پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے محسوسات پر پردہ ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

پھر بندہ انسان سے مشین بن جاتا ہے ۔اس لیے ضروری ہے کہ کبھی خود کو ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں تلاش کریں یقین جانیے نقصان نہیں ہو گا۔ میں اپنی برائیوں کے ساتھ نا جانے کب تک جیتا، اور اپنا خسارہ کرتا رہتا، ایک دن ابو مجھے ایک ایسے نیک شخص کے پاس لے گئے انہوں نے مجھے پر کچھ ایسا کرم کیا میں نے سب برائیوں کو چھوڑ دیا، ساتھ خود سے عہد کیا تھا کوئی ایسا کام کروں گا، جو مجھے خدا سے باندھ کے رکھے اور مخلوق خدا کی خدمت کا شرف بخشے۔ جب میں نے یہ ارادہ کیا تو اللہ نے یہ بات بھی میرے دل میں ڈالی کہ میں ایک یتیم خانہ کھولوں، تاکہ بے سہارا بچوں کی پرورش ہو سکے اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے ابو سے مشورہ کر کے نیک کام میں دیر کیسی ایک یتیم خانہ کھول لیا، اس میں اللہ کی فضل سے 300 بچوں کی کفالت کے ساتھ 55 ملازمین کو تنخواہ بھی دیتے ہیں یہ میرا کمال نہیں میرے اللہ کا کرم ہے۔ بنتی بگڑتی تقدیر کے باوجود خود کو حالات کے حوالے کرنے کے باوجود کبھی کبھی دل کی کسک بے چین کر دیتی ہے بہن بھائی ہما سب نے اپنی اپنی منزل پالی، اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک میرے ہی حصے میں تشنگی آئی لیکن کچھ مہینوں سے مجھے لگتا ہے میری قسمت اتنی بری نہیں، جتنی میں نے سوچی تھی۔ جب سے قندیل میری زندگی میں آئی تھی۔ وہ بہار کا جھونکا ثابت ہوئی تھی۔ میرا بھی جینے کو دل کرتا ہے زندگی کی گہما گہمی میں دل سے شامل ہونے اور انجوائے کرنے کو دل کرتا ہے۔ جس دل کو میں نے اتنے دکھ اور تکلیفوں کے بعد مردہ سمجھ لیا تھا۔ اب وہ پھر سے دھڑکنا چاہتا ہے۔

دنیا سے خوشی کشید کرنا چاہتا ہے۔ شاید چوہدری ذیشان ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر حال اور مستقبل میں جینا چاہتا ہے یہ سب اس ایک لڑکی کی مرہونِ منت ہے۔ جس کے خلوص اور سادگی نے چوہدری ذیشان کو باندھ دیا ہے۔ چوہدری ذیشان جس کے نام سے لوگ ڈرتے ہیں۔ وہ خود ایک لڑکی سے ہار گئے ہیں۔ پھر بھی یہ ہار مجھے خوشی دیتی ہے یہ سب سوچتے سوچتے اذان کی آواز پر چوہدری ذیشان نے آنکھ کھولی اور چونک گئے۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں گھومتے حال کی خوش کن لمحات کو سوچتے پتہ ہی نہیں چلا تھا رات بیت گئی ہے اور صبح صادق طلوع ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ درد بھی ٹیس دینے لگا تھا مخالف پارٹی کے ورکر ہونے کی جرم میں تین دن پہلے پولس نے 3mpo کے تحت اٹھوایا کے چار دن تشدد کا نشانہ بنایا تھا لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا تھا اور چوہدری نثار نے بیٹے کو نیم بے ہوشی کے عالم میں عدالت سے ہسپتال پہنچایا تھا۔

سارے دردوں نے مل کر چوہدری ذیشان کے آنکھوں کو نم کر دیا تھا لیکن دوسرے لمحے قندیل کا خیال آتے ہی ایک خوبصورت مسکراہٹ نے چوہدری ذیشان کے چہرے کو روشن کر دیا تھا ساتھ ایک پر سکون سانس بھی لیا، زندگی اب اگلی منزل کی جانب سفر کر رہی تھی اور یقیناً آگے کی سفر خوشیوں کے ہی ہوں گے سوچتے چوہدری ذیشان نے کمرے کی جانب قدم بڑھائے۔

مرزا غالب کی سوانح عمری

سونیا ارم

مرزا غالب کا اصل نام "اسد اللہ خان بیگ" تھا۔ آپ کے والد کا نام "مرزا عبید اللہ بیگ" تھا، جن کی شادی آگرہ میں مرزا غلام حسین کی بیٹی "عزت النساء بیگم" سے ہوئی تھی۔ انہی کے بطن سے مرزا غالب نے جنم لیا اور تاریخ میں اپنا نام رقم کیا۔
آپ 27 دسمبر 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ غالب کے بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کے چچا "مرزا نصر اللہ بیگ" نے اپنے ذمہ لے لی لیکن جب آپ آٹھ سال کے ہوئے تو چچا بھی فوت ہو گئے۔ مگر نواب احمد بخش نے انگریزوں سے مرزا کے خاندان کے لئے وظیفہ مقرر کرا دیا جو ان کی ضروریات کے لئے کافی تھا لیکن شادی کے بعد یہ وظیفہ ناکافی ہو گیا تھا۔ مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم "مولوی محمد معظم صاحب" سے حاصل کی۔ ان کی خوش قسمتی سے 1811ء میں مولوی "عبد الصمد" نامی ایک ایرانی عالم جو نو مسلم تھا سیر و سیاحت کے لئے آگرہ آئے اور غالب کے گھر قیام کیا۔ غالب نے دو سال ان سے فارسی، عربی، فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔
کھانے میں مرزا صاحب کو آم اور گوشت بہت مرغوب تھے۔ گوشت کھانے کھانے کے اتنے شوقین تھے کہ بیماری میں بھی نہ چھوڑتے اور آموں کی فصل میں ان کے دوست دور دور سے ان کے لئے آم بھیجتے تھے اور مرزا خود بھی اصرار کر کے منگواتے تھے۔

ایک دفعہ مرحوم بہادر شاہ آم کے موسم میں کچھ دوستوں کے ساتھ جن میں مرزا صاحب بھی شامل تھے "مہتاب باغ" میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ رنگ کے آموں سے جھول رہے تھے۔ یہاں کے آم بادشاہ یا بیگمات کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں ہو سکتے تھے۔ مرزا بار بار آموں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بہادر شاہ نے پوچھا: مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟

مرزا ہاتھ باندھ کر فرمانے لگے: دیکھ رہا ہوں کیا کسی پیڑ پہ میرا اور میرے باپ دادا کا بھی نام لکھا ہے؟

بہادر شاہ مسکرانے لگے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوادی۔

مرزا صاحب کی پہلی زبان اردو تھی لیکن انہیں فارسی اور عربی زبان پہ بھی عبور حاصل تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی نواب احمد بخش کے بھائی الٰہی بخش کی بیٹی "امراؤ" بیگم سے ہوئی اور وہ آگرہ سے دہلی چلے گئے۔

مرزا غالب اردو کے ایک نامور شاعر تھے۔ آپ نے گیارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ آپ کی بے شمار تصانیف ہیں، جن میں رقعاتِ غالب، دعائے سباح، اردوئے معلی اور دیوان غالب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اللہ نے آپ کو بے مثال قوتِ حافظہ عطا کیا تھا۔ کثرتِ شراب نوشی کے باوجود آپ کوئی بھی بات نہیں بھولتے تھے۔ غالب میں نثر نگاری کا بے مثال جوہر تھا۔ غالب کی شاعری ان کی شخصیت سے پھوٹتی ہے۔

غالب نے عشقیہ شاعری سے ہٹ کر قانون فطرت کو سامنے رکھ کر شاعری کی۔ آپ کو انیسویں صدی کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کا تخلص غالب تھا۔ نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ، خان بہادر اور نظام جنگ کے خطاب سے بھی نوازے گئے۔

غالب ؎ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

مرزا صاحب بہت سخی، ہمدرد اور نرم مزاج تھے۔ اپنے سینے میں ہر ایک کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔ ہر ایک سے دلی لگاؤ اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ یہی وجہ ہے جو ایک بار غالب سے مل لیتا اسے دوبارہ ملنے کا اشتیاق رہتا۔ حالات کی سنگینیوں، مصائب کی تلخیاں سہنے کے باوجود آپ میں حسِ مزاح بہت زیادہ تھی۔ آپ مہمان نواز بھی بہت تھے۔ لوگوں سے قرض لے کر بھی مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے۔ اکثر رات گئے تک دوستوں کی محفل لگی رہتی۔ غالب نے اپنے گھر میں جوا خانہ بھی کھول لیا جس کی وجہ سے انہیں دو بار جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔

غالب کی شراب نوشی اور کام چوری کی وجہ سے انہیں دوسروں سے ادھار لے کر گزارا کرنا پڑتا جس کی وجہ سے وہ مقروض ہو گئے اور پھر سب سے منہ چھپائے پھرتے۔ کثرتِ شراب نوشی اور موسم کی تبدیلی سے آپ بیمار پڑ گئے۔ علاج سے بھی افاقہ نہ ہوا۔ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والی بات ہوئی۔ دماغ پہ فالج کا حملہ ہوا جس کے باعث کومہ میں چلے گے اور 15 فروری 1869ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور آپ کو دہلی میں دفن کیا گیا۔ مرزا غالب کا شمار بھی ان لوگوں لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں دنیا آج تک یاد رکھے ہوئے ہے اور ان کے کلام کو اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی کہ ان کے لکھے اشعار، رباعیات، غزلوں اور نظموں کو تعلیمی نصاب میں بھی شامل کیا گیا۔ غالب کے کلام کی انگلی پکڑ کر کتنے ہی لوگ شاعر کے عہدے پہ فائز ہو گئے ہیں۔

مرجع خلائق
(قسط #1)

افتخار یونس

میں نورانی چہرے والے اپنے اباجی کے سامنے کرسی پر بیٹھا غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور ایک عرصے سے چارپائی پر ہیں۔ ٹھیک 55 برس قبل انہوں نے کلمے والا پرچم اٹھایا تھا، جیسے اب تک سینے سے لگا رکھا ہے وہ چلنے پھرنے سے معذور صاحبِ فراش ہیں لیکن میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ ابھی تک ان کے جذبے جواں ہیں۔ ان کے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان کے مشن کے ساتھ وابستگی پہلے روز کی طرح باقی ہے۔ مدت سے جی کرتا تھا کہ ان سے ماضی کی کچھ باتیں پوچھوں۔ آج میں نے ان سے سوال کیا تو وہ ماضی کے جھروکے میں کھو گئے، میری طرف غور سے دیکھا، مسکرائے اور بولے:

"میں راولاکوٹ کے گاؤں سنگولہ کی وارڈ آگرہ میں 1942ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں سے ہی حاصل کی اور مڈل پاس کر کے کوئٹہ بلوچستان چلا گیا تھا۔ بلوچستان میں ایک کوئلہ کمپنی میں مجھے کام مل گیا۔ میرے ساتھ کچھ اور قریبی رشتے دار بھی تھے۔ ہم سب ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ دن بھر کوئلہ کمپنی میں کام کرتے تھے اور شام کو کمرے میں آجاتے۔ ہم دن بھر مصروفیات کا تذکرہ بھی کرتے اور سیاست کے موضوع سے کمرے کی فضا بھی گرم رہتی تھی۔ یہ محفل عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتی اور رات 11 بجے تک جاری رہتی۔ ہر روز کی محفل میں مختلف موضوعات کے ساتھ ساتھ ایک آدمی کے بارے میں ڈسکشن ہوتی تھی۔

جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ولیوں مزارات اور درباروں کو نہیں مانتا اور اس کے عقائد بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ مجھے اس آدمی کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا کہ آخر وہ آدمی کون ہے جو لوگوں کو اپنے عقائد سے گمراہ کرنے کے ساتھ ساتھ شر پسندی بھی پھیلا رہا ہے۔ میرے اندر اس کے بارے میں یہ سب سن کر سخت نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ حکومت ایسے آدمی کو گرفتار کیوں نہیں کرتی جو معصوم لوگوں کی زندگیاں خراب کرتا ہے اور انبیاء، صحابہ اور ولیوں کی توہین بھی کر رہا ہے۔

1960 ء سے 1962 ء تک یہ زندگی کے معاملات ایسے ہی چلتے رہے ایک شام میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر شہر کی طرف آ رہا تھا۔

راستے میں ہم نے دیکھا چند نوجوان نعرے لگا رہے تھے اور ساتھ دیواروں پر چاکنگ بھی کر رہے تھے۔ میں ان کی طرف چل پڑا۔ جگہ جگہ لکھا تھا "چلو چلو مالی باغ چلو" عصرِ حاضر کے عظیم مذہبی مفکر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی تشریف لا رہے ہیں"۔ میں نے حیرت سے چاکنگ دیکھی جس فرد سے میں ملنا اور دیکھنا چاہتا تھا وہ خود چل کر ہمارے پاس آ رہا تھا۔

دوسرے روز میں کام پر نہیں گیا یہ سوچ کر مالی باغ ان کو دیکھنے چلا گیا کہ جن کا تذکرہ روز ہمارے کمرے میں ہوا کرتا تھا کہ دیکھوں یہ کہتے کیا ہیں۔

میں مالی باغ پہنچا تو ادھر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ گراؤنڈ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جگہ کم ہونے کی وجہ سے میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔

اسٹیج میرے سامنے تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ مولانا مودودی کون سے ہیں۔ میں نے قریب کے درخت پر بیٹھے ایک فرد سے اسٹیج کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "کیا یہ مودودی صاحب ہیں" اس نے کہا کہ نہیں مودودی صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ بہت دھیمے لفظوں کا بہترین چناؤ اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے اور سمجھانے کا انداز مجھے بہت پسند آیا وہ کہہ رہے تھے کہ قرآن و سنت کی دعوت لے کر اٹھو اور پوری دنیا پر چھا جاؤ ان کی تقریر سے مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ جس سے یہ لگے کہ ان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا یا کہا جاتا تھا وہ سچ ہے۔

جلسہ ختم ہوا تو میں قریب ہی ایک بک سٹال پر چلا گیا اور دوکاندار سے کہا کہ مولانا مودودی کی لکھی ہوئی کوئی کتاب اگر ہے تو مجھے دے دیں۔ مجھے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ انہوں نے مجھے "دینیات" دے دی اور کہا کہ اس کے پیسے نہیں لیتا۔ یہ میری طرف سے آپ کے ذوقِ مطالعہ کے لئے تحفہ ہے۔ میں نے پہلی بار یہ کتاب پڑھی تو مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔ میں مولانا کو سمجھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے 3 یا 4 بار "دینیات" پڑھی۔ مجھے ان کی مزید کتب پڑھنے کی جستجو پیدا ہوئی۔ چنانچہ "خطبات"، "تحریک اسلامی کی اخلاقی خوبیاں"، "اسلامی نظامِ حیات"، "الجہاد فی الاسلام" اور شہادتِ حق بھی تلاش کر کے پڑھیں۔ تب میں مولانا مودودی کی فکر اور فلسفے سے روشناس ہوا۔ اس کے بعد جب بھی ہمارے کمرے میں ان کا ذکر ہوتا تو میں مولانا کے حق میں بولنا شروع ہو جاتا۔ میں اپنے ساتھیوں کو بتاتا کہ مودودی صاحب کے بارے میں آپ کی رائے غلط ہے اور میں ان کو مودودی صاحب کا لٹریچر پڑھ کر سناتا۔

1964ء تک میں کوئٹہ میں کام کرتا رہا۔ اسی دوران میں نے "ادیب اردو" اور "اردو فاضل" کے کورسز مکمل کیے۔ ملک کے اندر ایوبی مارشل لاء لگا ہوا تھا۔ تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں پر پابندی تھی۔ جماعت کے پروگرامات بھی نہیں ہوتے تھے۔ مولانا کا لٹریچر پڑھنے کے بعد میری زندگی یکسر بدل گئی اور میں مودودی صاحب کا عاشق ہو گیا اور میں نے سوچا کہ یہی اصل کرنے کا کام ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بھی زندگی بھر قرآن و سنت کے نظام کے نفاذ کے لئے جد و جہد کرتا رہوں گا۔

یقین

اریبہ مظہر

سیاہ عبایہ میں ملبوس بے خطر و خوف چلتی لڑکی ہاتھ میں فائل لئے وہ بورڈ کی بلڈنگ کی جانب رواں دواں تھی۔ اپنے اس یقینِ کامل کے ساتھ کہ اس کا خواب ایک دن ضرور مکمل ہو گا، اس کی ماں کی گئی دعائیں اس کے حق میں قبول ہو گی ان شاءاللہ اور وہ دل سے پر سکون تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا رب اس کے یقین کو سچ میں بدل دیں گے اور اس کو کافی وقت لگا پر بورڈ کے ممبران نے طویل بحث کے بعد اس کی شرائط کو مان لیا تھا کہ اس کے ذہن میں دھماکہ ہوا کہ کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا تھا صرف اس کے ماں باپ اور ایک کزن کے علاوہ پر اسے رب تعالی کی ذات پر یقین کامل تھا اور یقین رکھنا بھی صرف رب کی ذات پر چاہے یا پھر والدین پر باقی دنیا صرف جھوٹی امیدیں دیتی ہے۔

وہ سادات تھی اپنی بات منوانا جانتی تھی کیونکہ وہ رب کے سامنے اس وقت جھکتی تھی جب ساری دنیا سو رہی ہوتی تھی۔ اسے اپنی کی گئی دعاؤں پر کامل یقین تھا یہ خواب تھا اس کا کہ وہ کسی جگہ اسلامی ادارہ کی تعمیر کروائے جہاں پر ہر طرح کی سہولیات میسر ہوں اور آج بورڈ نے اس کو جگہ اور ادارہ بنانے کی منظوری دے دی تھی۔

آج اس کے دل کی دنیا پر سکون اور سرشار تھی کہ اسنے جس چیز کا خواب دیکھا آج پورا ہو گیا مگر بہت سے رشتے اس سے چھوٹ گئے اس کامیابی کے سفر کے دوران مگر کون جانے ہر سفر کئی بری روحوں کو ہم سے دور کر دیتا ہے۔

سچ کیوں بولیں

مقیتہ وسیم

کچھ لوگوں کی غلطی بس اتنی سی ہوتی ہے وہ سچ بولتے ہیں۔ غلط بات پہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتے۔ اس لئے وہ زندگی کے مشکل موڑ پہ اکثر اکیلے رہ جاتے ہیں۔ در حقیقت ذاتی زندگی ہو یا کیریئر صرف سچ بولنا اور سچ کے لیے کھڑے ہونا آپ کو ترقی دلاتا ہے صرف سچ آپ کو بلندی پہ لے کر جائے گا کیونکہ وہ آپ کو ہلکا کر دیتا ہے اور آپ ہر بوجھ سے آزاد فضا میں پرواز کر سکتے ہیں۔ یہ جو دل ہے نا اس سے بڑی عبادت گاہ کوئی نہیں، اسے صاف رکھنا ہے۔ خدا کا گھر ہے یہ اور جو خدا کا گھر ٹھہرے بھلا اس میں جھوٹ حسد، نفرت، حقارت، عداوت اور سختی کا کیا گزر۔ اللہ کے نبی ﷺ نے سچ کہا اور ہمیشہ سچ کہا۔

اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ میں جب رات دیر سے گھر آتا تو میری ماں رات کو ہی اٹھ کر تازہ روٹیاں پکا کر دیتی تھی ایک دن ایسے ہی لیٹ آیا تو روٹی بناتے ہوئے انھوں نے پوچھا کہاں جاتا ہے؟

میں نے کہا "میں ادیب بن رہا ہوں۔"

کہنے لگی: "وہ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا: "اماں لکھنے والا (لکھاری)"

انہوں نے پھر سے سوال اٹھایا: "تو پھر کیا کرے گا؟"

میں بولا: "میں کتابیں لکھا کروں گا۔"

وہ بولیں: "اینیاں آگے پیاں جیہڑیاں کتاباں اوناں دا کی بنے گا؟"

میں نے کہا: "نہیں نہیں وہ تو جھوٹ ہیں میں سچ اور حق کے لیے لڑوں گا سچی بات کروں گا"۔

میری ماں ڈر گئی بیچاری ان پڑھ گاؤں کی عورت تھیں میں نے جب کہا کہ سچ بولا کروں گا سچ کا پرچار کروں گا تو اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی: "اگر تو نے یہی بننا ہے جو تو کہتا ہے اور تو نے سچ ہی بولنا ہے تو اپنے بارے میں سچ بولنا لوگوں کے بارے میں سچ بولنا نہ شروع کر دینا"۔

سچ وہ ہوتا ہے جو اپنے بارے میں بولا جائے جو دوسروں کے بارے میں بولتے ہیں وہ سچ نہیں ہوتا جب ہم بابا جی کے پاس گئے اور کبھی کبھی ان کے سامنے میرے منہ سے یہ بات نکل جاتی تھی کہ میں سچ بولا کروں گا تو وہ کہا کرتے تھے: "سچ بولا نہی جاتا سچ تو پہنا جاتا ہے سچ اوڑھا جاتا ہے سچ اوڑھنے کی چیز ہے بولنے کی نہیں"۔

جب نیت اللہ ہو تو راحت صرف سچ میں ملتی ہے۔ سچ کو اگر زہر میں بھگو کر کسی کے منہ پر ماریں گے تو وہ فساد کے زمرے میں ہی آئے گا۔

آپ سچے ہیں، سیدھی دو ٹوک بات کرنے والے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ منہ کے ساتھ توپ باندھ لیں۔ کون سی بات کس کے ساتھ کہاں، کیسے اور کب کرنی ہے اس کی سمجھ ہونا ضروری ہے۔ ہر بات، ہر جگہ، ہر شخص کے ساتھ ہر موقع پر نہیں کی جا سکتی۔ جب پتا ہو سچ فساد کا باعث بنے گا تو چپ رہنا افضل ہے۔ یقین مانیں جسے آپ بے باکی اور کھلے سچ کا نام دیتے ہیں وہ آپ کے منہ پھٹ ہونے کی نشانی ہے اور یہ بالکل بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔

آپ کہتے ہیں میں دل کا صاف ہوں، دیکھیں آپ کے دل کی خوبصورتی کسی نے نہیں دیکھی، آپ اپنے عمل اور اپنی بات سے پہچانے جائیں گے۔ وہ صاف گو ہے مگر بات کا ہنر سیکھے۔

اصل میں ہمیں ڈر لگتا ہے کہ اگر ہم نے اپنے بارے میں کچھ سچ بولا تو لوگ ہمیں کم تر سمجھیں گے، یہی خوف ہم سے پے در پے جھوٹ بلواتا چلا جاتا ہے اور بالآخر بیڑا غرق کروا کے چھوڑتا ہے۔

کیا حرج ہے اگر ہم بتا دیں کہ ہمیں کافی کا ٹیسٹ پسند نہیں، کوئی زبردستی تو ہمارے حلق میں کافی نہیں انڈیل دے گا۔ اپنی مثال اس لیے نہیں دوں گی کیونکہ مجھے کافی بہت پسند ہے میں جب بھی کافی منگواتی ہوں سب سے پہلے ختم کرتی ہوں، میرے دوستوں کو یقین ہے کہ میں کافی کی دیوانی ہوں، یہ بات بالکل سچ ہے کیونکہ چائے اور کافی میں وہی فرق ہے جو تاش اور شطرنج میں ہے۔ ہماری ایک معروف افسانہ نگار کی شادی کی عمر گزرتی جا رہی تھی، موصوفہ تقریباً کسی سے بھی شادی کرنے پر راضی تھیں لیکن دوسری طرف سے کوئی بھی قانونی اقرار کرنے کو تیار نہیں تھا۔

بالآخر 35 سال کی عمر میں ان کی شادی ہو گئی۔ انہوں نے شادی میں کسی کو انوائٹ نہیں کیا، ایک دن ایک تقریب میں مل گئیں تو میں نے شکوہ کیا کہ آپ نے چپکے سے شادی کر لی اور بلایا بھی نہیں۔ خوشی سے شرمندہ ہو کر بولیں "اصل میں سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ کئی رشتہ داروں کو بھی نہیں بلا سکی"۔ میں نے پوچھا: "ماشاء اللہ دولہا بھائی کرتے کیا ہیں"۔ یہ سنتے ہی اٹھلا کر بولیں "ان کی روٹیوں کی فیکٹری ہے۔" میری آنکھیں پھیل گئیں، بعد میں پتا چلا کہ دولہا بھائی کا ذاتی تندور ہے۔

ہمارے ہاں اپنی چیزوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا رواج اتنا زور پکڑ چکا ہے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذکر کرنا بھی اپنی توہین سمجھنے لگے ہیں۔

اگر آپ ایک ہائی ویلیو انسان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اقدار اور اپنے اصول بھی اونچے رکھنے ہوں گے۔
یہ مت سوچیں کہ آج سے میں نے سچ بولنا ہے۔ یہ سوچیں کہ آج سے میں نے جھوٹ نہیں بولنا۔
یہ مت سوچیں کہ اپنے وعدے پورے کرنے ہیں۔ یہ طے کرنا ہے کہ ایسا وعدہ کرنا ہی نہیں ہے جو پورا نہ کر سکیں۔
یہ مت سوچیں کہ مجھے قابل اعتبار کیسے بننا ہے۔ یہ طے کریں کہ کسی کا راز آگے نہیں دینا اور امانت میں خیانت نہیں کرنی۔
آپ نے اگر اعلیٰ اخلاقیات سیکھنی ہیں تو پہلے اپنے اندر سے کم درجے کی اقدار نکالنی ہوں گی۔

کاش

بنتِ زینب

دو برس قبل جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ میرے گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ بیٹھا زمین پر دائرے کھینچ رہا تھا۔ گھر داخل ہونے کے لئے دروازہ کھولا تو وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا: باجی بھوک لگی ہے۔

میں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ گرد و غبار سے اٹا ہوا چہرہ جیسے میلوں کا مسافر ہو، پاؤں پر گاڑھے سے بنے نقش و نگار جسے کوئی دلدل عبور کی ہو ہاتھ میں ٹوٹی ٹھنی پکڑے جیسے راستے میں رکاوٹوں کا اندیشہ ہو۔ بدن پر میلا کچیلا پھٹا پرانا لباس جیسے کوئی درویش ہو۔ معصوم نظروں سے مجھے تک رہا تھا۔ کیا ہوا آج امی نے کھانا نہیں دیا کیا؟

میں قدم بڑھاتے ہوئے بولی؟

میری ماں مر چکی ہے باجی!

میرے چلتے قدم تھم گئے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی اسے پورچ میں رکھی کرسی پر بٹھایا باورچی خانہ میں گئی، کھانا گرم کیا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ کھانا دیکھ کر جیسے اس کے چہرے پر رونق سی آگئی پسند ناپسند کا عذر کئے بغیر وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا کھا چکا تو کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ اب وہ ہر دوسرے تیسرے روز آ جاتا اور ہمیشہ ایک ہی سوال کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کے لہجہ میں دبدبہ آنے لگا اور بارعب آواز میں بات کرتا۔ جیسے مجھ پر اپنا حق سمجھتا ہو اور میں اس کے اس انداز پر مسکرا دیتی۔

پھر ایک روز وہ چڑی چھکے کی ضد کرنے لگا عید الفطر قریب تھی۔

محلے میں کھلونوں کے سٹالز پر بچوں کی بھیڑ رہتی میں نے اسے کچھ رقم دی وہ بھاگتا ہوا گیا اور کچھ ہی پل میں واپس آ گیا اور مجھے چڑی چھکا دکھانے لگا اور دکاندار سے ہوئی گفتگو کی تفصیل توتلی زبان میں بتانے لگا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے اس سے وعدہ لیا کہ اب تم گھر میں رہو گے۔ آوارہ بچوں کی طرح باہر نہیں گھومو گے اور ننگے پاؤں تو بالکل بھی نہیں۔ وہ ہر بار وعدہ کرتا کہ وہ آئندہ احتیاط برتے گا لیکن ایسا کیسے ممکن تھا۔ ویران گھر میں بھلا وہ کیسے رک سکتا تھا باپ کا سارا دن مزدوری کی تلاش میں گزر جاتا اور یہ معصوم پورا دن گلیوں کی خاک چھانتا۔

میں ہمیشہ اس سے پوچھتی حسن آپ سکول کیوں نہیں جاتے اس کا ہر بار ایک ہی جواب ہوتا باجی ماسٹر مارتے ہیں۔اب وہ بڑا ہو رہا تھا۔

اب اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس سائیکل ہو۔

اپنی اس خواہش کا وہ کئی بار اظہار کر چکا تھا اور میں اسے تاریخ پر تاریخ دے رہی تھی پچھلے ہفتے وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ میرے پاس آیا اور ہمیشہ کی طرح کھانے کا سوال کیا۔ اس نے کھانا کھایا اور بغیر کچھ کہے چل دیا۔ اس کا یہ انداز پہلے دن جیسا تھا۔

آج اس کا دوست میرے پاس آیا اور اداس لہجے میں بولا:

باجی حسن نہیں آیا؟

میں نے پوچھا کیوں نہیں آیا؟

باجی وہ مر گیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں، میں خود کو سنبھال نہ سکی۔

اس نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ ننگے پاؤں جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں کانچ چبھا اور زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی موت ہو گئی اور وہ اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔

باجی یہ بہت چھوٹا تھا جب اس کی ماں مر گئی تھی۔ کیا یہ ماں بیٹا ایک دوسرے کو پہچان لیں گے؟

وہ ہچکیاں باندھ کر رو رہا تھا۔

بھلا مائیں بھی بچوں کو بھولتی ہیں۔ وہ اتنی زندگی لکھوا کے آیا تھا لیکن مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کاش میں اسے سائیکل لے دیتی اور وہ زخمی ہونے سے بچ جاتا۔ اس طرح کے کتنے حسن ہمارے ارد گرد پھرتے ہیں اور ہم ان کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔

راشد منہاس شہید

فائزہ شہزاد

میں دوسری جماعت میں تھی جب اردو کی کتاب میں راشد منہاس شہید کے متعلق پڑھا تو وطن سے محبت کے اک انوکھے جذبے سے روشناس ہوئی اور ذہن میں ایک ہی بات بار بار آتی کہ کیا کسی کو اپنے وطن سے اتنی محبت ہو سکتی ہے کہ وہ اس کی خاطر جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ بچی تھی اتنی سمجھ نا تھی مگر چھوٹے بھائی کو جس کا نام بھی "راشد" ہے اس کو کہا کہ میرا دل کرتا ہے تم بھی بس "راشد منہاس" کی طرح ائیر فورس میں جاؤ۔ بھائی نے بھی بہت کوشش کی مگر ہر بار میڈیکل میں رہ جاتا اور ہم دونوں بہت روتے تھے مگر بس نصیب میں نہیں تھا۔

اتنے سال گزر گئے مگر ایک انسیت سی آج بھی وطن کے اس ہیرو سے ہے اور آج قلم اٹھایا کہ اپنی قوم کے عظیم بیٹے کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے جو جواں عمری میں اپنی جان اس ملک و قوم پر نچھاور کر گیا۔ پائلٹ آفیسر راشد منہاس 17 فروری 1951 ء میں کراچی کے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1968 ء میں سینٹ پیٹرک سکول کراچی سے سینئر کیمبرج کیا۔ آپ کے والد عبدالمجید منہاس سول انجینئر تھے اور تعمیراتی انتظام کے کاروبار سے منسلک تھے۔ آپ کے خاندان کے بہت سے افراد پاکستان کی مختلف افواج (بری، بحری، فضائی) میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اسی وجہ سے فوجی زندگی ان کا آئیڈیل بنی۔

اپنے ماموں ونگ کمانڈر سعید سے جذباتی وابستگی کی بناء پر فضائیہ کا انتخاب کیا جبکہ والد کی خواہش تھی کہ راشد بھی انجینئر بنے۔ بچپن سے ہی بہت ذہین و فطین تھے، تین بہنوں کے بعد پیدا ہوئے تو سب کے ہی بہت لاڈلے تھے۔ اگرچہ آپ کے بعد دو بھائی پیدا ہوئے مگر جو مقام آپ کا تھا وہ آپ کا ہی رہا شاید اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ سب بہن بھائیوں میں مختلف تھے اور والدہ کے ساتھ بہت محبت تھی۔17 سال کی عمر میں ائیر فورس میں شمولیت کی، تربیت کے لئے پہلے کوہاٹ اور پھر پاکستان ائیر فورس اکیڈیمی رسالپور بھیجے گئے۔

فروری 1971ء میں پشاور یونیورسٹی سے انگریزی، ائیر فورس لاء، ملٹری ہسٹری، الیکٹرونس، موسمیات، جہاز رانی، ہوائی حرکیات وغیرہ میں BS کیا۔

بعد ازاں تربیت کے لئے کراچی چلے گئے اور اگست 1971ء میں پائلٹ آفیسر بنے۔ بچپن سے ہی بہادروں کے قصے پڑھنے کا شوق تھا۔ کتابوں کی پوری ایک لائبریری تھی اس کے ساتھ ساتھ جہازوں کے چھوٹے چھوٹے ماڈل بھی جمع کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی تحفے میں ہوائی جہاز دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے اور اپنا جیب خرچ جمع کر کر کے بھی وہ ہوائی جہاز کے ماڈلز خرید لیا کرتے تھے۔ 10 سال کی چھوٹی سی عمر میں ہوائی جہازوں کے متعلق بہت معلومات تھیں، جہازوں کے نام ان کی اقسام اور رفتار کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔ باقاعدگی سے ڈائری لکھا کرتے تھے۔ کھیلوں میں ہاکی اور سنوکر کے بہت دلدادہ تھے۔

"ٹیپو سلطان" کے اس قول کو اکثر دہرایا کرتے تھے "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" ایوب خان مرحوم کا یہ قول بے حد پسند تھا "آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو" ایک جگہ ڈائری میں لکھتے ہیں "انسان فانی ہے اور موت برحق ہے اسے ایک نہ ایک دن ضرور جانا ہے۔ کوئی شخص ابد تک زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے انسان کو چاہیے کہ اپنی مختصر سی زندگی میں کوئی اچھا کارنامہ سرانجام دے۔ اگر ممکن ہو تو اپنی عمر ملک و قوم کی خدمت میں گزار کر نیک نامی حاصل کرے"۔ منفرد شخصیت اور منفرد مزاج کے حامل تھے، غیر معمولی ذہانت کے ساتھ ساتھ حاضر جواب، شریر ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے۔ بچپن میں ایک بار وہ اپنے کتے سے کھیل رہے تھے والد مجید منہاس نے دیکھا تو کہا:

"ہاتھ نہ لگانا وہ پلید اور نجس ہے۔" چند دن کے بعد راشد کے والد نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ پیچھے باندھے کتے سے کھیل رہے ہیں۔ بڑی حیرت ہوئی ابھی کچھ کہنے والے تھے کہ راشد نے معصومیت سے کہا: "میں کتے کو ہاتھ نہیں لگا رہا اب تو میرے ہاتھ پلید نہیں ہوں گے۔" والد یہ سن کر مسکرا اٹھے۔ جب تک رات کو ڈائری نہ لکھ لیتے سوتے نہیں تھے ایک جگہ ڈائری میں یہ بھی لکھتے ہیں: "کسی شخص کے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہوگا کہ اپنی جان ملک کے لئے قربان کر دینا" اور انہوں نے اپنا یہ لکھا سچ کر دکھایا اور قوم کے اس شاہین نے اپنی جان اس وطن پر وار دی لیکن ملک کی سالمیت پر آنچ نہ آنے دی۔

پاکستانی ایئر فورس کے تاریخ دان "قیصر طفیل" اپنی تحریر "بلیو برڈ 116 از ہائی جیکڈ" میں لکھتے ہیں کہ بنگلہ دیش کی آزادی سے چار ماہ قبل کی بات ہے جب پاکستانی فضائیہ میں لڑاکا طیاروں کے پائلٹوں کو تربیت دینے والے فلائٹ لیفٹیننٹ مطیع الرحمان نے 1971 ء کی جنگ میں مغربی پاکستان موجودہ پاکستان کے خلاف بغاوت کی۔ کراچی میں تعینات بنگالی افسروں کو احساس ہو گیا تھا کہ ہائی انٹیلی جنس ان پر نظر رکھے ہوئے ہے اس لئے ان افسروں میں طے پایا کہ ایئر بیس پر موجود افسران کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے اور کھلے عام آپس میں کبھی ایک ساتھ نہیں ملیں گے اور اندر ہی اندر منصوبہ بنایا کہ پاکستانی جنگی طیارے کو ہائی جیک کر کے بھارت لے جائیں گے۔

طے یہ ہوا کہ سولو مشن پر جانے والے "ٹی 33" کو ہائی جیک کرنا آسان ہو گا جبکہ "ایف 86" کو ہائی جیک کرنا مشکل ہو گا کیونکہ زیادہ لوگوں کی موجودگی سے شک پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظر انتخاب راشد منہاس پر ہوئی جس کی 20 اگست کو تیسری تنہا پرواز تھی۔ اس دن راشد منہاس نے "سکوارڈن کریوروم" میں ناشتہ گرم کروایا۔ انہیں اس روز پرواز پر جانا تھا مگر کراچی کے آس پاس موسم خراب تھا جو تنہا جانے کے لئے مناسب نہ تھا اس لئے پرواز کینسل کر دی گئی لیکن اچانک موسم بہتر ہو گیا اور راشد کو کہا گیا کہ وہ اڑنے کی تیاری کریں۔ راشد نے ناشتہ درمیان میں ہی چھوڑا، فلائٹ لیفٹیننٹ "حسن اختر" سے پرواز کی بریفنگ لی اپنی یونیفارم پہنی،

دو گلاب جامن (گویا شہادت کا اعزاز پانے سے پہلے قدرت نے منہ میٹھا کروادیا تھا) کھائے اور کوکا کولا کے دو، تین گھونٹ لئے اور اپنے ٹرینر جیٹ طیارے میں سوار ہوئے ہی تھے کہ ان کا بنگالی انسٹرکٹر سیفٹی فلائٹ آفیسر مطیع الرحمان خطرے کا سگنل دے کر کاک پٹ میں داخل ہو گیا۔ غدار مطیع الرحمان کے پاس کچھ خفیہ دستاویزات تھے جنہیں وہ بھارت لے کر جانا چاہتا تھا(مطیع الرحمان کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا پرائمری تعلیم کے بعد پاکستان کے سرگودھا کے PAF میں داخل ہوا اور1961ء میں پاکستان ائیر فورس میں شمولیت اختیار کی اور جون 1963ء کو جنرل ڈیوٹی پائلٹ برانچ کمیشن کیا گیا اور وہ1971ء کی جنگ سے قبل پائلٹوں کی تربیت کے فرائض انجام دے رہا تھا)

اس نے طیارے میں داخل ہوتے ہی اس کا رخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ راشد نے ماڑی پور کنڑول ٹاور سے رابطہ کر کے بتایا تو انہیں ہدایت کی گئی کہ طیارے کو ہر قیمت پر اغوا ہونے سے بچایا جائے۔ اس دوران جب راشد منہاس نے طیارے کا کنڑول حاصل کرنے کی مزاحمت کی تو اس غدار نے انہیں بیہوش کر دیا۔ پاکستانی وقت کے مطابق "دن کے گیارہ بج کر اکیس منٹ" پر طیارے کا رخ بھارت کی طرف تھا۔ اسی دوران راشد نے ہوش آنے کے بعد "گیارہ بج کر تینتیس" منٹ پر اطلاع دی کہ مجھے طیارے سمیت اغواء کیا جا رہا ہے اور اس کے بعد کنڑول ٹاور سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ اگلے پانچ منٹ راشد اور غدار انسٹرکٹر کے درمیان طیارے کے حصول کی کشمکش میں گزرے۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
اس شعر کی تفسیر کی مانند راشد منہاس نے پلٹ کر اس غدار پر جھپٹا اور طیارے پر کنٹرول حاصل کیا اسی چھینا، جھپٹی میں راشد نے محسوس کیا کہ مطیع الرحمان کی تجربہ کاری کی بناء پر طیارے کو کسی محفوظ جگہ لینڈ کرانا ممکن نہیں تو انہوں نے آخری حربے کے طور پر طیارے کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور پوری قوت سے وہ آلہ دبا دیا جو جہاز کو نیچے کی طرف لاتا ہے۔ یہ سب اس مردِ مجاہد نے ایسا اچانک سے کر دیا کہ اس غدار کو کچھ سمجھنے کا، کرنے کا موقع ہی نہ ملا اور طیارہ زمین سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔
جس کے نتیجے میں دونوں وفات پا گئے لیکن ایک قابلِ رشک موت یعنی "شہادت" کا عظیم رتبہ پا گیا اور تاریخ میں نام امر کر لیا جبکہ دوسرا "غدار" کہلایا اور تاریخ میں اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے گا۔
بقول شاعر

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
مومن کا نشاں اور منافق کا نشاں اور
راشد کی شہادت پہ ہے اقبال کا یہ قول
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس وقت کے فوجی صدر یحیٰ خان کو جب یہ پوری کہانی سنائی گئی تو انہوں نے کہا کہ "یہ لڑکا نشانِ حیدر سے کم کا حق دار نہیں"۔
29 اگست 1971 ء کو نشانِ حیدر دینے کا اعلان کیا گیا تھا جسے 31 جنوری 1977 ء کو ان کی والدہ مسز رشیدہ منہاس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں مگر مسکراتے لبوں سے وصول کیا۔ راشد منہاس پی اے ایف کے واحد آفیسر اور سب سے کم عمر جواں ہیں جنہیں پاکستان کا سب سے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشانِ حیدر عطا کیا گیا۔

نوعمری میں وطن کے لئے جان کا نذرانہ پیش کر کے راشد منہاس نے عظیم مثال قائم کی اپنی بہادری سے غدار کے مذموم مقاصد کو ناکام بنا دیا۔ وطن کی عزت و ناموس کی خاطر، اس کی آن کی خاطر ایسی انوکھی ادا سے قربان ہوا کہ کائنات بھی جھوم اٹھی، قوم ایسے جواں مرد اور بہادر سپوتوں کی قربانیوں کی مقروض ہے اور انہیں سلام پیش کرتی ہے۔

اے راہِ حق کے شہیدو! وفا کی تصویرو!
تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
چلے جو ہو گے شہادت کا جام پی کر تم
رسولِ پاک ﷺ نے بانہوں میں لے لیا ہو گا
علیؓ تمہاری شجاعت پہ جھومتے ہوں گے
حسینؓ پاک نے ارشاد یہ کیا ہو گا
تمہیں خدا کی رضائیں سلام کہتی ہیں
جنابِ فاطمہؓ جگرِ رسول ﷺ کے آگے
شہید ہو کے کیا ماں کو سرخرو تم نے
جنابِ حضرتِ زینبؓ گواہی دیتی ہیں
شہیدو! رکھی ہے بہنوں کی آبرو تم نے
وطن کی بیٹیاں، مائیں سلام کہتی ہیں
اے راہِ حق کے شہیدو!
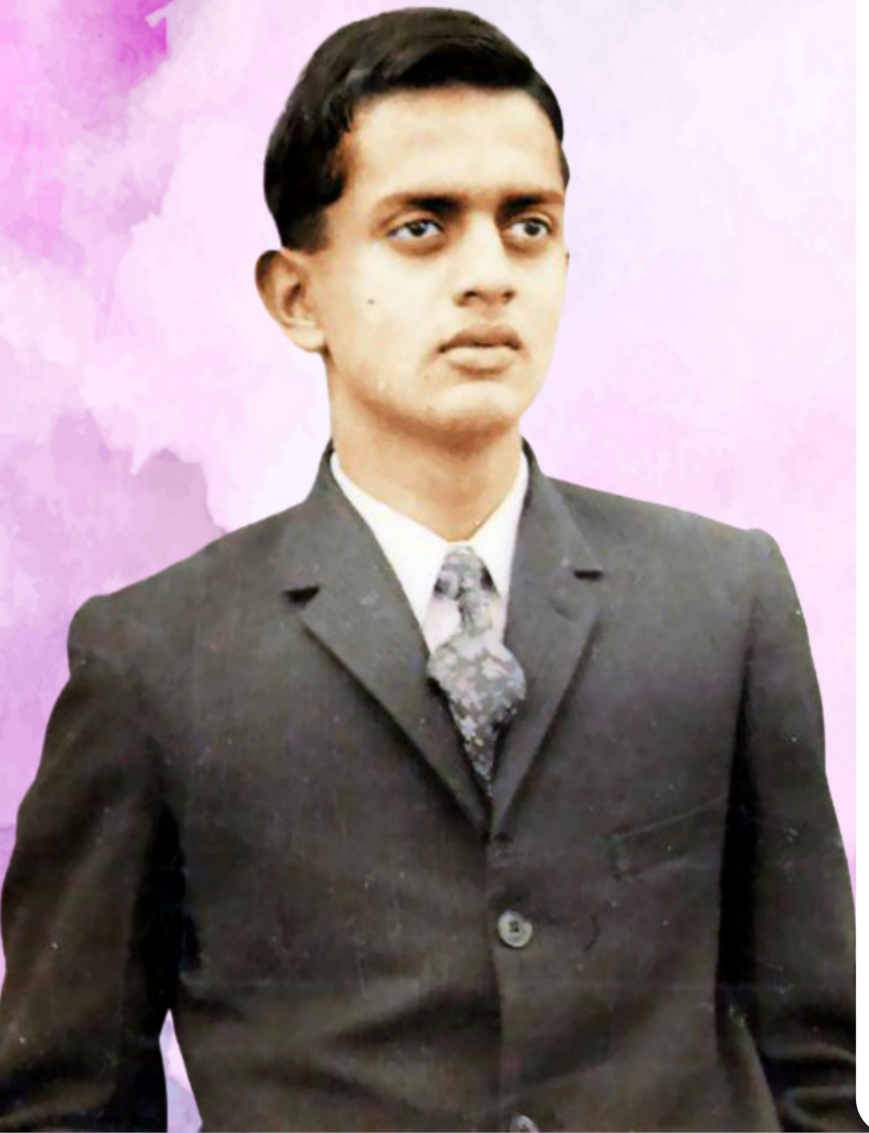
مقصدِ حیات

سحر فاطمہ امانی

رک جاؤ نبراس میری بات سن لو۔ کیوں کر رہے ہو تم ایسے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ایک لڑکی کے لیے تم اپنی بہن کو کیوں سب کے سامنے رسوا کر رہے ہو؟ وہ گلی میں ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی اس کو روک رہی تھی۔ تم مان کیوں نہیں لیتے کہ وہ تمہارا نصیب نہیں ہے؟ اور یہاں نبراس رک گیا تھا۔ اب اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے واپس آ کر بہن کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ خود بھی بیٹھ گئی تھی۔ نبراس نے روتے ہوئے سر اپنی چھ سال بڑی بہن کی گود میں رکھ دیا تھا۔ یہ چہرہ چھپانے کی ناکام کوشش تھی۔ میرا نصیب، میرے نصیب میں تو کچھ بھی نہیں تھا بیا صرف سات سال کا تھا۔ جب ماں باپ اس دنیا سے چلے گئے۔ آپ نے مجھے ان کے ساتھ اپنی شفقت سے بھی دور کر دیا۔ مجھے میرا قصور بتائیں۔ میں ہی محبتوں میں اتنا بد نصیب کیوں ہوں؟ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا بیا۔ مجھے بچا لیں میں مر رہا ہوں۔ میں مر جاؤں گا۔ کوئی میری سانسیں کھینچ رہا ہے۔ میں اسے کسی اور کی دلہن کے روپ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ بیا میں مر جاؤں گا۔ آپ مجھے جانے دیں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ تایا ابو مجھ سے اسے چھین لیں گے۔ مجھے انہیں روکنے دے دیں پلیز بیا۔ آس پاس لوگ کھڑے اس پچیس سال کے مرد کو روتے دیکھ چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ اسے اب سمجھ آ رہا تھا۔ نبراس کو بچپن میں تایا کو دے کر اسنے کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔

وہ خود اپنے اکلوتے بھائی کی تکلیف کو سمجھ رہی تھی مگر خود بے بس تھی۔ تایا ابو کی منتیں تک کر آئی تھی۔ مگر وہ نہیں مانے تھے۔ اب بھائی کو ہی سمجھانے میں ہلکان ہوتی جا رہی تھی۔ اسی وقت موبائل کی رنگ ٹون بجی تھی۔ فون اٹھاتے ہی نبراس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ میں منا لوں گا تایا ابو کو تم بس میرے آنے کا انتظار کر لو پلیز تم انہیں کسی اور کے لیے رضا مندی مت دینا لیکن اگلے لفظ تھے یا کوڑے۔ نبراس پتھر ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اب آنسو نہیں قہر برسا رہی تھیں۔ اس نے پتھریلے لہجے میں اگلے کی بات کا صرف ایک جواب دیا تھا۔ میری محبت میری بہن سے زیادہ پیاری نہیں ہے مجھے یاور مینگل صاحب۔ آپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہے رخصت کر دیں۔

میں اس گھر میں تو کیا اس شہر میں بھی قدم نہیں رکھوں گا اب لیکن خضدار کے ایک ایک بچے کو اپنا نام ضرور یاد کروا دوں گا۔ کیونکہ میں مرحوم جنرل اسمائر مینگل کا بیٹا ہوں۔ جس نے اپنے خاندان کے لیے اپنے قبیلہ کے لیے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ میں اپنا نام غداروں میں کبھی نہیں لکھواؤں گا۔ میں اس شہر میں تو قدم نہیں رکھوں گا لیکن اپنی بہن کو دیا وعدہ ہر حال میں پورا کروں گا۔ خضدار کے مسائل اب صرف صوبائی سطح پر ہی نہیں ملکی سطح پر اٹھاؤں گا۔ میں آپ کی اس خواہش پر آپ کو تحمل سے انکار کر رہا ہوں اور یہ اس احسان کا بدلہ ہے جو آپ نے پندرہ سال میری پرورش میں لگا کر مجھ پر کیا۔ ورنہ اگر میں وہاں آ گیا تو آپ کے بیٹے کی اس گھٹیا فرمائش پر اسے تو کیا آپ کے پورے گھر کو آگ لگا سکتا ہوں۔

بات کرنے سے پہلے آئندہ دھیان رکھئے گا کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں۔ اس نے فون بند کرتے ہی دیوار میں مار کر توڑ دیا تھا اور بیا اسمائر کے سہارے سے کھڑا ہوا تھا۔ یہ صرف زمین پر کھڑا ہونے کا آغاز نہیں تھا بلکہ زندگی میں ہی کھڑا ہونے کی طرف ایک نو عمر لڑکے کا آغاز تھا۔ بیا اسمائر اپنے بھائی کا یہ روپ پہلی دفعہ دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہ آیا کہ وہی لڑکا ہے جو چند لمحے پہلے رو رہا تھا مگر اسے آج اپنی کالج کی ایک سہیلی کی بات یاد آئی تھی کہ بلوچوں پر تو غیرت ختم ہے ان پر جب بات بہن بیٹی کی آئے تو پھر تباہ کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔

چند سال بعد پریس کانفرنس کا منظر تھا۔یہ کانفرنسز خضدار میں آج کل عام ہو رہی تھیں۔

خضدار کے مسائل ملکی سطح پر ہر ایک کی زبان پر آ گئے تھے اور ساتھ ان مسائل کی طرف دھیان دلانے والے شخص کا نام بھی لوگوں کو ازبر ہوتا جا رہا تھا۔ سب سماعتیں پلک جھپکے بغیر سامنے بولنے والے کی منتظر تھیں۔ لیکن اس نے سلام اور خیریت کے بعد لمبی چوڑی کوئی تمہید نہیں باندھی تھی بلکہ کہا تھا آپ سوال کریں اور ایک نو عمر لڑکے نے سوال کیا تھا۔

نبراس مینگل صاحب بلوچوں کے بارے میں ایک بہت برا تاثر پھیلا ہوا ہے کہ یہ دہشت گرد ہوتے ہیں۔ غیر قانونی کاموں میں ملوث پائے جاتے ہیں آپکا کیا خیال ہے اس بارے میں؟

نبراس مینگل سمجھ گیا تھا یہ اس کی زات اور قبیلہ کو نشانہ بنایا جا رہا ہے لیکن اس نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا۔

دھیان سے بیٹھے اپنی سیٹ پر زیادہ ادھر ادھر نہ ہلیں آپ کی سیٹ کے نیچے بم ہے جناب جو پھٹ سکتا ہے اور سب کے باآواز بلند قہقہے گونجے تھے۔ دوسرا سوال ایک لڑکی نے کیا تھا کہ بلوچ خاندانوں پر یہ تاثر بھی ہے کہ وہ اپنی خواتین کو پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کی عورتیں باشعور نہیں ہو پاتیں اور پھر یہاں نبراس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے سب کو خاموش کروا کر بولنا شروع کیا۔ نبراس مینگل بول رہا تھا اور پورا آڈیٹوریم خاموش ہو کر سن رہا تھا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ نبراس مینگل اس وقت بلوچستان کا پہلا ایسا بزنس مین تھا جو اپنے بزنس کا چالیس فیصد منافع خضدار کی فلاح کے لیے صرف کر رہا تھا اور پھر جو اسنے اپنے ورکرز کے لیے شرائط رکھیں تھیں اس نے اخبارات کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔

اس نے اپنے ورکرز کی پہلی شرط حافظِ قرآن ہونا رکھی تھی۔ اس وقت وہ ملک کے نامور بزنس شخصیات کی اول صف میں تھا۔ اس نے بلوچ خواتین کے لیے کالجز کے قیام کی طرف بھی لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا مگر یہ ابھی کسی کو نہیں پتا تھا کیونکہ وہ واقف تھا کہ کون کون اس کے مقاصد کو ختم کرنے کے در پہ ہے۔ آڈیٹوریم کے سب سے آخری سیٹ پر بیٹھی ایک خاتون نے سوال کیا تھا نبراس مینگل صاحب آپ کا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے اور آڈیٹوریم قہقہوں سے بلند ہوا تھا۔ یہ سوال ہر کانفرنس میں ہوتا تھا مگر آج سوال کرنے والا اہم تھا۔ اس لیے جواب دینا نبراس کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ نبراس نے ہلکا سا کھنکھار کر جواب دینا شروع کیا۔

اگر کوئی انتظار میں ہے تو اسے میرا پیغام پہنچا دیجیے کہ نبراس مینگل پلٹ کر دیکھنے والوں میں سے نہیں ہے۔ کھوئی ہوئی چیزوں اور لوگوں پر ماتم منانے والا نہیں ہے۔ بہت جلد خضدار کے لوگ میری شریکِ حیات سے ملیں گے۔ وہ بھی میری طرح بہادرانہ انداز سے بلوچستان کے لیے کام کر رہی ہیں۔ جواب دیتے ہوئے اس کے دماغ کی سکرین پر ایک لڑکی چلاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس سال کے اندر شادی کرنی ہے نبراس اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہیں اغوا کروا لوں گی اور تم جانتے ہو میں ایسا کر سکتی ہوں۔ نبراس کے چہرے پر پھر سے مسکراہٹ آ گئی تھی اور سوال کرنے والی خاتون دکھی دل سے اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

اسے یاور مینگل کے گھر تک کا سفر پھر کانٹوں پر طے کرنا تھا اور یہ کانٹے شاید اب پوری زندگی کے لیے اسکا مقدر ٹھہرے تھے۔ اس نے بھی اپنے باپ اور بھائی کے لیے نبراس کو بہت دکھ دیئے تھے۔ اب سزا بھی پوری زندگی بھگتنی تھی۔ نبراس گاڑی میں بیٹھتے ہوئے تھوڑا آگے چلنے والی خاتون کو دیکھ کر پشیمان تو ہوا تھا۔ پورے راستے وہ یہی سوچتا آیا تھا کہ اگر اسے تایا کی حقیقت کا علم نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ وہ جانتے تھے بیا پرانی ساری جائیداد کو فروخت کر کے وہاں کالجز بنانا چاہتی تھیں مگر تایا جی وہاں کے لوگوں میں اس لیے شعور پیدا ہونے نہیں دینا چاہتے تھے کہ کہیں ان کی وہاں سے حکومت نہ ختم ہو جائے۔ اسی لیے انہوں نے بیا کی شادی اپنے اس بیٹے سے کرنے کی خواہش ظاہر کی جو پہلے سے شادی شدہ تھا۔

افسوس! لالچ اولاد کی خوشیاں بھی کھا جاتا ہے۔ کاش میں آپ سے کبھی معافی مانگ سکتا حورب مگر میرے لیے میری محبت سے زیادہ میری بہن اہم ہے۔ اس کے خوابوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔ خضدار کے لوگوں کے چہروں پر خوشی جو سکون مجھے پہنچاتی ہے وہ شاید آپ کا ساتھ بھی نہ دے پاتا۔ سوچوں کی ڈور گاڑی کے رُکنے سے ٹوٹ گئی تھی اور گاڑی کے سامنے شیشے سے نظر آتی زیرِ تعمیر عمارت نبراس مینگل کے خوابوں کی تعبیر کی طرف اگلا قدم تھی۔ جو اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کی مقصدِ حیات سے آگاہی کے لمحات نبراس مینگل کی زندگی کو روشن کر چکے ہیں۔

کھیل تماشہ

مریم بشیر احمد

لوگ پہلے آپ کے ساتھ بہت اچھے سے رہتے ہیں۔ آپ کو ایسے یقین دلاتے ہیں جیسے ان کے سوا آپ کا کوئی ہے ہی نہیں۔ ساری باتیں شیئر کرنے لگ جاتے ہیں جیسے ان کا سکون صرف آپ ہیں۔
لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد یہی لوگ پھر آپ کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں اور باقی رہی زندگی تنہائی میں مبتلا کر دیتے ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے راستے کے آگے سے گزر جاتے ہیں اور آپ کو پتا تک نہیں چلتا۔

پھر کیا ہوتا ہے؟ یہی لوگ آپ کو جینا سکھاتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے یہاں کوئی نہیں کسی کا۔ نہ اپنا، نہ کوئی پرایا یہاں بس رشتے ناتے وقت گزاری ہے۔ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے جو کبھی بھی کسی بھی حال میں تنہا نہیں چھوڑتی ،نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔
بےشک یہ دنیا صرف ایک کھیل تماشہ ہے۔

موت کا انتظار ہے زندگی

یاسمین ناز

زندگی نام رکھ دیا کس نے؟
اصل میں تو موت کا انتظار ہے زندگی۔
دراصل ہم پیدائش سے موت تک اک سفر طے کرتے ہیں۔ ہماری حثیت ایک راہگزر کی سی ہوتی ہے۔
یہ الگ بات ہے کہ ہم زندگی کے مختصر سفر کو ہمیشہ کی زندگی سمجھ لیتے ہیں اور دنیا کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں موت آجاتی ہے اور موت ہمیں اندھیروں کی وادی میں دھکیل دیتی ہے جہاں ہمارا حسن چاہتیں اور جوانیاں سب فنا ہو جاتا ہے۔ چند دن کے اندر ہی انسان کے چاہنے والے بھول جاتے ہیں۔
موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا ہے۔ ہاں لوگ رب العالمین کو جھٹلاتے ہیں مگر موت کو نہیں۔

دنیا میں آنے والے ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور موت کیا ہے؟
میں نے جب موت سے پوچھا کہ تو کیا ہے؟
اس نے کہا میں وہ ہوں جو مرنے کے ساتھ ہی آپ کا نام تک مٹا دیتی ہوں لوگ نام کے بجائے آپ کو میت کا نام دیتے ہیں۔
میں آپ سے آپ کی دولت، شہرت، عہدہ، حسن، جوانی، آپ کا اہل و عیال، غرض سب کچھ چھین لیتی ہوں اور لوگوں کو اندھیری کوٹھری میں دھکیل دیتی ہوں۔
میں بستے گھروں کو لمحے میں اجاڑ دیتی ہوں اور ایسے ویران کر دیتی ہوں کہ جسے ان میں آباد ہی کوئی نہیں تھا۔
آپ کی وہ جگہ جہاں آپ بیٹھتے ہیں وہاں کسی اور کو بٹھا دیتی ہوں۔

جس جسم کو سجانے سنورانے میں آپ اپنی زندگیاں تک کھلا دیتے ہیں۔ چند دن کے اندر ہی اس کو مٹی میں ملا دیتی ہوں۔
ہاں میں وہ وحشت ہوں جس سے ڈرتے سب ہیں مگر اپنے لئے کرتے کچھ نہیں۔
لوگ ساری زندگی مجھ سے دور بھاگنے اور دنیا جیتنے میں لگے رہتے ہیں مگر میرا وار ان کو ہرا دیتا ہے اور آخر وہ مٹی تلے منوں بن کے سو جاتے ہیں۔ زندگی کی ساری کی ساری خواہشیں اور چاہتیں اس کے ساتھ مٹی ہو جاتی ہیں۔
زندگی کیا ہے؟ ایک سچا جھوٹ، فریب ہے، زوال ہے، دھوکہ ہے، حرص و ہوس کا جال ہے جس میں انسان آتے ہی اپنی آخرت کو بھول جاتا ہے۔
آخر کیوں ہم انسان نہیں سوچتے کہ یہ دنیا ایک فانی جہاں ہے۔

ساٹھ ستر سالہ زندگی گزارنے کے لیے اتنی دیوانگی کہ ہمیشہ کی زندگی کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ بھول جاتے ہیں۔
میں بتاؤں کہ دنیا چڑھتے سورج کی بچاری ہے۔ بس نظروں سے اوجھل ہونے کی دیر ہوتی ہے لوگ بھول جاتے ہیں کہ آپ بھی کوئی تھے۔
جن لوگوں کو دکھانے کے لیے ہم اپنا لباس تک بدل دیتے ہیں انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کتنے حسین ہیں۔
لوگ کچھ وقت تک آپ کو یاد کرتے ہیں پھر اس کے بعد آپ ان کے لیے اک خیال بلکہ ایک داستان بن کے رہ جاتے ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد آپ کی جگہ کوئی اور لے لیتا ہے۔ آپ کے دوست احباب اور آپ کے خیر خواہ سب آپ کو بھول جاتے ہیں۔

پھر انسان ایک ایسی بھولی ہوئی داستان بن جاتا ہے کہ جیسے وہ کبھی دنیا میں آیا ہی نہیں۔ زندگی پہ جب موت حملہ آور ہوتی ہے تب انسان کے سارے کے سارے پلان دھرے رہ جاتے ہیں اور اسے ایک نئ منزل کی جانب گامزن ہونا پڑتا ہے۔
ہر دنیا میں آنے والے انسان کہ یہی کہانی ہے کہ جب تک وہ زندہ رہتا ہے، ایسے رہتا ہے کہ جیسے کبھی مرے گا نہیں اور مر ایسے جاتا ہے جیسے کبھی جیا ہی نہیں۔
یہ زندگی ایک دھوکہ ہے۔ یہ کچھ لمحات ہیں جو رب نے ہمیں دے کے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ اک مقررہ وقت پر موت نے آنا ہے اور زندگی کا سفر تمام ہو جانا ہے۔
عالم برزخ کی طرف کا سفر انتہائی مشکل ہے۔

یہ وہ قیامت ہے جو ہم نہ چاہتے ہوئے بھی سر کریں گے مگر خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو رب العالمین کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہیں۔
ہر روز قبر آواز لگاتی ہے کہ اے غافل انسان میں کیڑے مکوڑوں کا گھر ہوں، میں وحشتوں کا گھر ہوں۔ یاد رکھ تجھے میرے اندر آنا ہے۔
گزرتے وقت لمحے ہمیں موت کے قریب تر کرتے جا رہے ہیں مگر حیرت ہے کہ ہم سوچنے کو تیار ہی نہیں کہ ہم نے قبر میں جانا ہے۔

خواتین کی خودمختاری

فائزہ صابر

ہمارے معاشرے میں جہاں ایک طرف بیٹیوں کو رحمت سمجھا جاتا ہے اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ ان کی ہر بات کا مان رکھا جاتا ہے۔ انہیں نازوں سے پالا جاتا ہے تو وہیں دوسری طرف انہیں ایک بوجھ قرار دیا جاتا ہے۔ ایک ایسا بوجھ جسے کوئی بھی اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اگر کسی کے ہاں دو یا تین بیٹیاں پیدا ہو جائیں تو ان پر تو جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ ہائے! یہ ہمارے ساتھ کیسی ناانصافی ہو گئی ہے۔ اور پھر ساری زندگی ان رحمتوں کے ساتھ ناروا سلوک قائم رکھا جاتا ہے اور ان کی ماں کو بد قسمت قرار دے دیا جاتا ہے اور پھر وہ ساری زندگی گھر اور باہر والوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنی رہتی ہے۔

اس سارے کھیل میں صرف اور صرف عورت بیچاری ساس کے طعنے، شوہر کی بے رخی اور دنیا والوں کی تنقید کا نشانہ اور لوگوں کے تبصروں کا مرکز بن کے رہ جاتی ہے اور بات طلاق تک جا پہنچتی ہے۔ اس سارے عمل میں عورت کے جذبات کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ کوئی اس سے اس کی مرضی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ وہ کیا سوچتی ہے، کوئی اس سے استفسار نہیں کرتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ ایسے میں مرد اسے اپنے پاؤں کی جوتی جیسے القابات سے نوازتا ہے اور وہ مظلومیت کہ داستاں بن کر خود کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے اور ظلم و جبر کو برداشت کرتے کرتے اپنی شناخت تک کو ہی کھو دیتی ہے لیکن اپنے جائز حقوق کے لئے پھر بھی آواز نہیں اٹھاتی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے! کیوں اسے اپنے حق کے لئے آواز اٹھانا نہیں سکھایا جاتا۔ کیوں ہمارے معاشرے میں عورت کو اتنا بے وقعت کر دیا گیا ہے۔ کیوں اسے مرد اپنے پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ کیوں! اس کیوں کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ عورت نے خود اپنے مقام کو سمجھا ہی نہیں، اپنے لئے آواز اٹھانا کبھی اس نے سیکھا ہی نہیں اور ہمارا معاشرتی نظام بھی اسے خود مختار بنانے کی بجائے ایک مرد کا محتاج کر دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بچپن سے ہی بیٹیوں کو تابعداری کے گن گھول گھول کر پلائے جاتے ہیں اور صرف یہ کہہ کر کہ "آگے جاکر بھی انہوں نے چولہا ہی سنبھالنا ہے"۔ جیسے جملوں کی وجہ سے گھر گھرستی کے علاوہ کچھ اور سکھایا ہی نہیں جاتا ہے۔

یہ بات بھی ٹھیک ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ کچھ اور کام یا ہنر سیکھ ہی نہیں سکتیں۔ اسی چھوٹی سوچ کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں عورت کا مقام و مرتبہ وہ نہیں رہا جو اسے دلایا گیا تھا۔ اسے شریعت نے ہر حق دلایا ہے لیکن لوگوں کی اس طرح کی سوچ نے وہ سب کچھ عورت سے چھین لیا ہے۔ اسی سوچ کی وجہ سے انہیں خود مختار نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ انہیں تابعداری کی چادر اوڑھا کر ساری عمر بٹھائے رکھتے ہیں۔ لیکن کوئی ہنر، کوئی مہارت انہیں نہیں سکھائی جاتی۔ جسے سیکھ کر وہ اپنی زندگی میں آگے بڑھ سکیں۔ جسے سیکھ کر وہ معاشرے میں عزت کی روٹی کما سکیں۔ اور انہیں لوگوں کی طرف مدد طلب نظروں سے نہ دیکھنا پڑے۔ اور نہ ہی انہیں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پڑے۔

اگر ہر والدین اپنے گھر کی بہن بیٹی کو اس کی شادی سے پہلے ہی خود مختار بنا دیں تو کسی بھی مرد کی ہمت نہیں ہو گی کہ وہ اس سے اس طرح کا جارحانہ سلوک قائم رکھے۔ اللہ پاک نے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا ہے لیکن عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ لیکن یہاں تو الٹی ہی گنگا بہہ رہی ہے کہ مرد خود کو تو حاکم سمجھتا ہی سمجھتا ہے لیکن ساتھ میں عورت کو محکوم بھی سمجھتا ہے۔ لیکن یہ ایک جاہلانہ سوچ ہے اور ہمارا اسلام بھی اس چیز کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ اسلام میں اللہ کے نبی نے عورتوں کے معاملے میں نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے لیکن بد قسمتی سے مردوں کو اپنا حاکم ہونا تو یاد ہے لیکن عورت کا رحمت ہونا، اس کے ساتھ نرمی اختیار کرنا، یہ سب یاد نہیں ہے۔

اسلام میں مساوات کا درس دیا جاتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں عورتوں کو مساوات کے میم تک بھی رسائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے نبی ﷺ کے دور میں عورتوں کو اس قدر آزادی تھی کہ وہ تجارت یعنی بزنس تک کرتی تھی۔ جی ہاں اس دور میں بھی عورتیں تجارت کیا کرتی تھیں۔ جس کی درخشاں مثال حضرت خدیجہؓ ہیں۔ لیکن افسوس آج کل کے دقیانوسی مرد عورت کو صرف اور صرف پاؤں کی جوتی اور اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ان کی محتاج ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر والدین اپنی اپنی بیٹیوں کو خود مختار بنائیں تاکہ معاشرے میں موجود اس جاہلانہ سوچ کا خاتمہ ہو سکے اور ہماری بہن، بیٹیاں کسی کے رحم و کرم پر نہ رہیں۔

وہ اتنی خود مختار ہو جائیں کہ انہیں کسی کی سامنے محتاجی والا ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اور وہ زمانے کی بے رحم ٹھوکروں سے بچ سکیں اور اس بے رحم معاشرے میں سر اٹھا کے جی سکے۔ خدارا انہیں صرف گھر گرہستی ہی نہ سکھائیں بلکہ انہیں اس معاشرے کے بے رحم بھیڑیوں کا مقابلہ کرنا بھی سکھائیں اور یہ تبھی ممکن ہو گا جب وہ خود مختار کہلائیں گی۔

دل کے ساتھ دماغ لیے چلنا

زعیمہ روشن

انسانی جسم میں دل اور دماغ دونوں بہت اعمیت کے عامل ہیں۔ دونوں میں سے اگر ایک بھی کام نہ کرے تو دوسرے کی بھی اہمیت نہیں رہتی۔

کسی چیز کا فیصلہ کرنا ہو تو دل جس کی طرف عمادہ ہوتا ہوتا ہے اکثر دماغ اس کے خلاف گواہی دیتا ہے اور کامیاب فیصلہ دماغ کا ہوتا ہے کیونکہ دماغ سوچ کے فیصلہ کرتا ہے اور دل بنا سوچے فیصلہ کر کے دھوکہ کھا جاتا ہے۔

دونوں کی جنگ میں جیت زیادہ تر دماغ کی ہوتی ہے۔

دماغ کی عقلمند لوگ سنتے ہیں جب کے معصوم لوگ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکے دماغ کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور پھر نقصان بھرتے ہیں۔

دماغ ہمیں ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے انسان کو تکلیف نہ ہو اور انسان سے ایسے فیصلے کرواتا ہے جس سے اکثر دل منکر ہوتا ہے مگر وہ فیصلے انسان کے حق میں بہتر ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس دل آپ کو ایسی بھول بھلیوں میں لے جاتا ہے جہاں آپ کو ہر چیز صاف اور اچھی دکھائی دیتی ہیں سہی اور غلط کی پہچان دل مشکل سے کرتا ہے۔

دل کے ساتھ دماغ لیے چلو تو پھر دماغ اور دل مل کے جو فیصلہ کریں وہ ہی انسان کے لیے بہتر ہے۔

ضرورتِ رشتہ

نمرہ رانی

نسبتاً، مروّتاً، کنایتاً، ضرورتاً، ارادتاً، فطرتاً، قدرتاً، حقیقتاً، حکایتاً، طبیعتاً، وقتاً فوقتاً، شریعتاً، طاقتاً، اشارتاً، مصلحتاً، حقارتاً، وراثتاً، صراحتاً، عقیدتاً، وضاحتاً، شرارتاً، شرافتاً، امانتاً، دیانتاً، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! ایک نو عمر سید زادہ، نیک چلن اور سیدھا سادہ، کامل شرافت کا لبادہ، کبھی بائیک پہ کبھی پیادہ، طبعیت کا انتہائی سادہ، پست کم اور لمبا زیادہ، کاروبار کرنے کا ارادہ، اپنی ماں کا شہزادہ، حسن کا دلدادہ، شادی پر آمادہ،

خوبصورت جوان، اعلیٰ خاندان، اپنا ذاتی مکان، رہائش فی الحال پاکستان، ابھی پاس کیا ایم اے کا امتحان، کبھی نادان، کبھی شیطان، ایک دفعہ ہوا یرقان، کافی بار کروایا چالان، عرصہ سے پریشان کے لئے،

ایک حسینہ مثلِ حور، چشم مخمور، چہرہ پُر نور، باتمیز باشعور، سلیقے سے معمور، نزاکت سے بھرپور، پردے میں مستور، خوش اخلاقی میں مشہور،

باہنر سلیقہ مند، صوم و صلوۃ کی پابند، کسی کو نہ پہنچائے گزند، نہ کوئی بھابھی نہ کوئی نند، ستاروں پہ نہ سہی چھت پہ ڈالے کمند، صاف کرے گھر کا گند،

با ادب باحیا، پیکرِ صدق و صفا، اک مثالِ وفا، سب کی لے دعا، نہ ہو کسی سے خفا، نہ کرے کسی کا گلہ، نرالی ہو جس کی ادا، ہو باصفا،

نہ شائقِ سرخی و کریم، اعلیٰ تربیت و تعلیم، سیرت و کردار میں عظیم، نرم خوئی میں شبنم و شمیم، سوچ میں قدیم، علالت میں حکیم،

کوئی مہ جبین، بے حد حسین، پردہ نشین، ذہین و فطین، بہن بھائیوں میں بہترین، پکانے کی شوقین، میٹھا بھی اور نمکین، ساتھ لائے قالین، سسرال کی کرے تحسین، شوہر جب ہو غمگیں تو کرے حوصلے کی تلقین، ساس کے سامنے مسکین، لفظ منہ سے نہ نکالے سنگین، گھر کی کرے آرائش و تزئین، ہر بات پہ کہے آمین!

یوں رہے جیسے پاکستان کے سامنے انڈیا، روس کے سامنے امریکہ، سعودی کے سامنے یمن،

بقید حد، دراز قد، مصروف ید، حکم نہ کرے رد، پاک ہو جس کا قد،

آہستہ خرام، شائستہ کلام، پیارا سا نام، مٹھاس جیسے چونسہ آم، رفتار جیسے تیز گام، شوہر کی غلام، زبان پر لگام، بات میں نہ کوئی ابہام، زبان پر نہ کوئی دشنام، امن و آشتی کا پیغام، خاندان میں لائے استحکام،

جانتی ہو ہر کام، کبھی نہ ہو زکام، سب کا کرے احترام، ساس سے نہ لے انتقام، شوہر پر ہوں جو آلام، جلد بازی میں نہ کرے اقدام، مچائے نہ کوئی کہرام،

عجوبۂ کائنات، مصائب میں ثبات، عاریِ جذبات، ہمہ وقت محوِ خدمات، نہ کرے سوالات، تمام دے مگر جوابات، اعلیٰ و ارفع صفات، رفیقۂ حیات، صابرِ ممات درکار ہے،

لڑکا ہمارا طلبگار ہے، لیکن کچھ بے قرار ہے، رابطے کا آپ کو اختیار ہے، اگر آپ کو اعتبار ہے، جلد جواب پر ہمیں اصرار ہے، ورنہ زندگی بےکار ہے، گرائیے جو رستے میں دیوار ہے، اب تو بس ہاں کا انتظار ہے۔

نہ مسہری یا چارپائی، نہ روئی بھری رضائی، نہ قلم کے لیے روشنائی، نہ شوہر کے لیے ٹائی، نہ زیور طلائی،

البتہ نکاح سے پہلے رسمِ حنائی، منگنی پر مٹھائی، نکاح پر فائرنگ ہوائی، بارات کے لیے دودھ ملائی، تھوڑی سی خود نمائی، تاکہ نہ ہو جگ ہنسائی، بعد میں نہ ہو لڑائی۔

شکوک سے پرہیز، بیاہ کے لیے بھاگو تیز، ابھی مٹی ہے زرخیز، کچھ کرسیاں اور میز، بس اس قدر جہیز، ہماری قوم نہ انگریز نہ چنگیز،

لڑکی آپ کی بھی کنواری ہے، شادی نہ ہوئی تو ہماری بھی خواری ہے، بتائیں اگر کوئی دشواری ہے، ہماری تو پوری تیاری ہے، ہاں کرنا آپ کی رواداری ہے، لڑکا ہمارا اناڑی ہے، مگر کاروباری ہے۔

ابھی طالب علم ہے اور منہ میں زبان اور کبھی کبھی سگریٹ پیتا ہے۔

مزید بات چیت بالمشافہ، یا بذریعہ لفافہ، بصورت ازیں چڑیا گھر میں دیکھیں زرافہ،

خط و کتابت بو عدہ صیغۂ راز ہے۔
دوستو! یہ آرزو دل کی آواز ہے۔

مکان / کمرہ نمبر: 16
پریشان چوک

رموز حیات
(قسط #1)

مسرت جبین

ماخلقت ھذا باطلا
فرمان باری تعالیٰ ہے کہ کچھ بھی بے کار پیدا نہیں کیا گیا۔
خالقِ کائنات نے کائنات بنانے کا ارادہ فرمایا۔ کیا خوب کائنات بنائی، کیا کمال اس کی خوبصورتی کیا جمال اس کی رعنائی، کتنی حکمت وتدبر سے بنایا گیا ہے۔
کیسے کیسے دلکش نظارے، نظروں کو خیرا کر دینے والے رنگ، کیسی کیسی انوکھی نرالی حیرت زدہ کر دینے والی مخلوق، کتنے ہیبت ناک درندے، کیا کمال نزاکتوں سے تراشے فضاؤں کو چیرتے ہوئے پرندے، حشرات الارض کی اقسام بھی شمار میں لانا انسان کے بس میں نہیں ہے۔
سات مضبوط آسمان اور ان میں بسنے والی مخلوق سوائے خدا واحد کے کسی کے احاطے علم میں نہیں۔
سات زمینوں میں چھپے خزانے، دوڑتی بھاگتی زندگی کے راز ہیں انسان کے پاس سمندروں کی پاتال میں کتنی کیسی کیا کیا مخلوق ہے، کوئی سراغ رساں سراغ ہی لگا سکا ہے؟
ان لاتعداد کمال خوبیوں اور طاقت وقوت والی مخلوق میں سے اللہ رب حکیم نے انسان کمزور ترین مخلوق کو قرآن مجید میں خود ربِ کائنات نے فرمایا ہے کہ، ہم انسان کو کمزور پیدا کیا، اسی کمزور تخلیق کو اشرف المخلوقات کے درجے پہ فائز فرمایا گیا۔
کائنات کا اصول ہے کہ جس کا جتنا اعلیٰ وارفع مقام، عہدہ، منصب ہوگا اس کی اتنی ہی اہم بڑی ذمہ داری بنتی ہے۔
رب العالمین نے انسان کو ایک حقیر قطرے سے پیدا فرمایا۔

بے بس، لاچار، کمزور، ناتواں مگر خالق کی محبت و شفقت کا اعجاز ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے ماں کی چھاتیوں میں اس بھوکے پیاسے کے لیے خوراک کا انتظام کیا گیا۔
تنہا تھا، ماں کی شفقت بھری آغوش ملی، باپ کے نام کا سائباں، بھائی قوت بازو بنے۔
بہنیں محبت کی چھاؤں اور پھر زندگی کے درجہ بدرجہ مراحل میں پل پل سامان زندگی اور حفاظت کے سارے انتظامات بھی پہلے سے تیار تھے۔ جوانی میں دل کے لیے دل لگی کو زوج کے خوبصورت رشتے میں باندھ دیا۔ جسم کو قوت و طاقت صلاحیت کمال جمال سے نوازا۔
کارِ سفر میں کارِ جہاں دراز کیا۔ زندگی کے سب رنگ سب ڈھنگ، چلن، طریقے سیکھا دے۔ علم و فن، جوہر و ہنر سے مزین بھی کیا۔ رشتے، ناطے، سہارے، دیے۔

آب و دانہ، گل و گلزار سے زندگی کا لطف بڑھایا۔
غرض رب العالمین نے کسی مادی و جسمانی، روحانی ضرورت کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔
ہمارا خالق تو ربِ کائنات ہے۔ اس نے انسان کو ایسی نعمتیں دی کہ کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی۔
سوال ہے کہ اگر ربِ کریم یہ سب دیتا مگر انسان کو ایک اہم ترین نعمت سے محروم رکھتا؟
ربِ کائنات نے انسان کے رہنے کے ٹھکانوں کا بھی خوب خیال رکھا نہ صرف انسان بلکہ تمام مخلوقات کے طرح طرح کے ٹھکانے بنائے۔ ہر مخلوق کے لیے اس کا ٹھکانہ اہم ہے، پیارا ہے۔
سکون اسے اپنے گھر میں ہی آ کر ملتا ہے۔ اللہ رب رحیم نے سب سے پہلے آدمؑ کو جنت میں ٹھکانہ عطا فرمایا۔ بابا آدمؑ ہمارے باپ اعظم۔

جنت سے اس کی حکمت سے اس کے اذن سے زمین پہ اتارے گئے۔ ہم گو زمین کے باشندے ہیں مگر ہم سب نے واپس اپنے گھر ہی جانا ہے اور والدین کا گھر ہی اولاد کا گھر ہوتا ہے۔
جنت سے نکالے گئے جنت ہی منزل ہے۔ اگر انسان کچھ وقت کے لیے کہیں جائے وہاں اس کو ہر طرح کا سامان زیست بہت بہت پر آسائش ملے بھی۔ کیا پھر وہ اپنے گھر کو بھول کر ہمیشہ اپنے گھر کے بغیر رہ سکتا ہے، نہیں ناں؟
کبھی نہیں؟
اچھا کوئی اس آسائشوں میں گھر کا رستہ بھول جائے تو کیا ہو گا۔
اچھا ہم زندگی میں ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں۔ اگر میں نے ملتان جانا ہے تو کیسے جا سکتی ہوں۔ پہلی بات کہ مجھے معلوم ہو کہ ملتان ہی میری منزل ہے۔ وہی میرا اصل ٹھکانہ، گھر ہے۔ ہمیشہ کے سکون بھری سکونت۔

اس بات کا ادراک بھی ہو کہ ملتان جانے کے کون کون سے ذرائع ہیں، کہاں ہیں۔ مجھے کوئی اسٹیشن پہ تو پہنچا دے یا خود پہنچ جاؤں مگر یہ ہی نہ معلوم ہو کہ کونسی گاڑی مجھے میری منزل تک لے جانے گی۔ کب، کیسے لے جائے گی، لے کر جائے گی یا راستوں میں ہی چھوڑ دے گی۔
ذرا سوچیں جب تک یہ ساری معلومات صحیح معلوم نہ ہوں۔ منزل پہ پہنچنا مشکل نہیں ناممکن ہے۔
بالکل اسی طرح ہمارے مالک و مختار اللہ نے ہمیں ہر ہر نعمت سے نوازا ہے۔ زندگی کے پہلے سانس سے آخری ہچکی تک۔
یہ سب کچھ ہوتا مگر اہم ترین نعمت، نعمت ہدایت نہ ہوتی۔
اپنے گھر کے رستے ہی نہ پتہ ہوتے تو یہ سب کس کام کا؟
ایک انسان کو زندگی کی جدید سہولیات سے آراستہ گھر مل جائے۔

اس میں تمام ضروریات زندگی موجود ہوں۔ جدید ترین ٹیکنالوجی، ہر کام کے لیے مشینوں سے اس کا گھر بھرا ہو مگر اسے ان تمام ٹیکنالوجی کو استعمال کا طریقہ کار ہی نہ آتا ہو تو اس کی زندگی کیسے سہل ہو سکتی ہے، سب بیکار۔

دیہات میں ایک بیوہ عورت جس کا ایک ہی بیٹا تھا رہتی تھی۔ اس کا بیٹا بیرونِ ملک چلا گیا۔ وہ بیوہ عورت غربت و افلاس کی زندگی بسر کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ حالانکہ اس کا بیٹا ہر ماہ اس ڈالر بھیج رہا تھا۔ ہر ماہ وہ بیٹے کے بھیجے گئے ڈالر کو سینے سے لگاتی۔ ہونٹوں سے چومتی اور ایک برتن میں رکھ دیتی۔ مرنے کے بعد اس کے گھر سے کثیر تعداد میں ڈالر ملے مگر خود اس کی اپنی زندگی کس حال میں گزری۔ صرف صحیح فہم ادراک علم نہ ہونے کے نتیجے کائنات کے سارے خزانوں

میں سب سے قیمتی خزانہ نور ہدایت قرآن مجید فرقان حمید اللہ کی رحمت سے ہمارے لیے موجود ہے۔ یہ کتاب ہدایت نور مبین اللہ نے اپنے بندوں کے لیے اتاری ہے۔ مگر اس انجان عورت کی طرح ہمیں اس نعمتِ عظمیٰ کا ادراک نہیں۔

نہیں ادراک تو ہے شعور بھی ہے مگر جانتے ہوئے انجان بن چکے ہیں۔ ایسی دولت جو نہ صرف دنیا میں سکونِ جان و قلب ہے بلکہ آخرت میں نجات کے ساتھ سامان راحت بھی۔

جو قبر کی وحشتوں میں رفیقِ میدانِ محشر میں شفاعت کرنے والا اور پل صراط پہ نور بن کر ہمیشہ ساتھ نبھانے والا ہے۔ زندگی سے موت اور موت سے حشر تک ایک واحد نور ہدایت قرآن ہے جو راہنمائی کرتا ہے۔ قرآن اور اہلِ قرآن، نبیِ مہربان ﷺ کو رشد و ہدایت کا منبع مان کر اسی راستے پہ یقین کے ساتھ راہنمائی پائیں۔

اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اور اس عورت کی طرح مفلسی، جہالت کی، کی چادر اوڑھ کر ہمیشہ کی نیند سو جائیں اور تہ دامن رہ جائیں۔
خالی جھولی، خالی ہاتھ، ہاتھ ہی ملتے رہ جائیں۔
اللہ رب العالمین کے سب احسانات میں سے سب سے بڑا احسان ہدایت ہے کہ ساری نعمتیں اسی کی مرہونِ منت ہیں۔

دعا

رابعہ ذوالفقار

مشکل کسی نوعیت کی بھی ہو آسانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اگر آپ اپنے گھر والوں سے تنگ ہیں، سسرال سے تنگ ہیں، جاب سے تنگ ہیں، ہاسٹل سے تنگ ہیں، اس صورت حال میں دعا کر لیں، کیونکہ ہمارا رب کہتا ہے:

ادعونی استجب لکم

مجھے پکاروں میں تمھاری "دعائیں قبول کرتا ہوں"۔ (المؤمن: 60)

دعا کر لیں یا اللہ ان لوگوں کی محبت میرے دل میں ڈال دے۔ جن سے مجھے چڑ ہے بیزاری ہے، جن کی وجہ سے میں کچھ نہیں کر پاتی یقین کریں معاملہ آسان ہو جائے گا، خرابی پتہ کب آتی ہے جب ہم یہ دعا نہیں کرتے کہ یا اللہ ان دلوں کو میرے لیے مسخر کر دے، مجھے ان کے لیے کار آمد بنا دے،

اپنے ماحول کی صحت کے لیے بھی دعا کریں، بہترین زندگی کے لیے دعا کریں، شرح صدر کے لیے دعا کریں، دعا کریں کہ الٰہی مجھے لوگوں کے لیے نفع مند بنا دے جب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہم اکثر فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں ڈٹ کے مقابلہ کرنا چاہیے، مشکلات تو آتی ہی ہمیں کند بنانے کیلیۓ ہیں، جن سے ہم تنگ ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے دل برداشتہ رہتے ہیں، اگر ہم ان کی ایک لسٹ بنا لیں کہ کون کون مجھے تنگ کرتا ہے؟ میں کس کس سے پریشان ہوں جو میری صحت خراب کر رہا ہے۔ پھر ہر اس ٹیڑھے انسان کے لیے دعا کر لیں۔

وہ سیدھا ہو جائے گا یا ہمارے دل سے نکل جائے گا اور ہم سکون میں آ جائیں گئے۔

جب ہم معاملہ اللہ کے سپرد کرنے کی بجائے خود سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا ہوتا ہر وقت وہ ہمارے سر پر سوار رہتا، فلاں نے میرے ساتھ یہ کیا تو میں اس کے ساتھ اس طرح پیش آؤں گی، فلاں نے میری بات کا مان نہیں رکھا میں کیوں اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں، ان سوچوں کے ساتھ، ان انتقامی رویوں کے ساتھ، ان نفسیات کے ساتھ ہم کچھ نہیں کر سکے گئے۔ ذہنی سکون کے لیے، صحت مند زندگی کے لیے، رشتوں کو بچانے کے لیے، اللہ کے آگے سجدہ ریز ہونا ہے اور یہ دعا کرنی ہے۔

"اللھم لا سھل الآ ما جعلتہ سھلا وانت تجعل الحزن سھلااذا شِئتَ"

اے اللہ! کوئی کام آسان نہیں مگر جسے تو آسان کر دے اور جب تو چاہتا ہے مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔
(صحیح ابن حبان:974)

(حصہ شاعری)

غزل نمبر #1

حمزہ ارشد

یہ بد حالی ہے، خوشحالی نہیں ہے
مرے آنگن میں ہریالی نہیں ہے

تمہیں پھر سے بسا لیتا میں دل میں
محبت ہے، کوئی گالی نہیں ہے

مرے مذہب میں ہیں عیدین پیارے
مسلمانوں میں دیوالی نہیں ہے

قبیلہ مجھ سے دائم خوش رہا ہے
انا میں نے کبھی پالی نہیں ہے

مقدر پر بہت نازاں ہے حمزہؔ
یہ دل ایمان سے خالی نہیں ہے

غزل نمبر #2

حمزہ ارشد

زمانے میں جو کہتے پھر رہے ہیں تیرا چرچا ہے
بتائیں گے مجھے اتنا انہوں نے دیکھا کیا کیا ہے

تعلق توڑنے والے سے کیا کہتا وہ اپنا تھا
مجھے چھوڑا تو وہ نادان دیکھو اب بھی تنہا ہے

برس ہونے کو آیا ہے، فقط دیدار کرتا ہوں
بتا دینا اسے، ظالم پہ کالا سوٹ جچتا ہے

مری آنکھیں کسی دوجے کا کوئی خواب کیوں دیکھیں
مری اب دید کے قابل وہی بس ایک چہرہ ہے

فقط اک نام ہے دنیا میں جس کے زیرِ سایہ ہوں
مجھے لگتا ہے اس کے حسن کا ہر اک پہ سایہ ہے

یہ دنیا آنسوؤں کا نام دیتی ہے جسے یارو
کبھی تم نے مری آنکھوں میں وہ موتی بھی دیکھا ہے؟

بھنور مجھ کو کبھی گرداب تک لے کر نہیں جاتا
خدا شاہد ہے، میرا منتظر رہتا کنارہ ہے

جسے پہچاننے سے بھی کبھی انکار کرتا تھا
وہ اب مانوس سا چہرہ تری اکھیوں کا تارہ ہے

میں اب اچھا، برا کچھ بھی کہوں معیوب لگتا ہے
فقط اتنا سا کہتا ہوں مرا معیار اپنا ہے

جو ظالم مسکرا کر زندگی برباد کرتا ہے
دلِ نادان سا کہتا ہوں کہ وہ شخص جھوٹا ہے

بتا کیسے یقیں آئے تجھے اس کی محبت کا
سراپا زندگی جس شخص کی بس ایک دھوکا ہے

بہت طعنے دیے لوگوں نے سو اشعار میں جاناں
انہی لوگوں کی باتوں کا کیا میں نے خلاصہ ہے

کسی کے سامنے اظہار سے خاموش رہتا ہوں
مرا خاموش رہنا ہی مجھے اکثر ڈبوتا ہے

یہاں عشاق مارے عشق کے گلیوں میں پھرتے ہیں
کہیں مجنوں پریشاں ہے کہیں مجبور لیلیٰ ہے

کسی کی بے بسی ہم کو نظر آتی نہیں کیونکہ
یہاں پر آنکھ والوں کا زمانہ سارا اندھا ہے

تجھے ہم پیار کر بیٹھے مگر حیرت میں ڈوبے ہیں
یہی اب سوچتے ہیں عشق کیا خود غرض ہوتا ہے

بہت مہنگا پڑے گا تم کو دستورِ جہاں حمزہؔ
محبت سے زمانے نے مجھے اکثر ہی روکا ہے

45 کے رکشہ میں سفر ہو رہا ہے

نورین اسلم

45 کے رکشہ میں سفر ہو رہا ہے
اس لائن کا بچہ اس لائن میں ہو رہا ہے
یونہی رکشہ چلا
لے کر نام اللہ اللہ
ابھی آدھا ہی کیا تھا طے راستہ
فوراً ہی گر گیا بستہ
جونہی رکشہ رکا
ہر کوئی اوپر نیچے جھکا
اگر ہو جائے رکشہ خراب
بن جائے ہمارے لیے عذاب
میرے پیارے رکشہ ہو جا ٹھیک
یا تو بھی بن گیا ہے ہماری طرح ڈھیٹ

اب ہم ہو جائیں گے لیٹ
سکولوں کے بند ہو جائیں گے گیٹ
سن لے انکل رکشہ مین
ہمیں اب تو ہو گا فین
بیچ دو انکل یہ رکشہ ہے بے کار
اس کی وجہ سے روز پڑے ہمیں مار
ٹیچر کہے بیٹا تم ہو بڑے کول
تمہیں تو یہ کہنا بھی ہے فضول
ایک دن نہیں روز کا ہے تمہارا کام
اب تو کرنا پڑے گا خارج تمہارا نام
ہر کوئی بیٹھا ہے پھنس پھنسا کے
ہو رہا ہے سفر ہنس ہنسا کے
45 کے رکشہ میں سفر ہو رہا ہے
اس لائن کا بچہ اس لائن میں ہو رہا ہے

(خطوط)

خط نمبر 1#

ثنا اکرم ملہی

پیاری فاکہہ!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! امید ہے آپ اللہ کی رحمت میں ہوں گی۔ خاکسار کو بے حد حزن ورنج پہنچا جب برقی مواصلات سے آپ کے والد کے انتقال کی خبر پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی مغفرت فرمائے اور بلندیِ درجات ہو۔ بے شک یہ ایک ایسا سانحہ ہے جو بچوں کو بوڑھا کر دیتا ہے۔ خاکسار کی جانب سے اور پورے حلقہ القلم اردو جہانیاں کی جانب سے اظہارِ تعزیت قبول کیجیے۔ اِنَّ للہِ مَا اَخَذَ وَلَہُ مَا اَعْطٰی وَکلٌ عِنْدَہُ بِاَجَلٍ مُسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ۔ اللہ تعالیٰ والد مرحوم پہ اپنی رحمت فرمائے اور ان کے تمام گناہوں پہ در گزر فرمائے "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہُ وَارْحَمْہُ وَعَافِہِ وَاعْفُ عَنْہُ وَاَکْرِمْ نُزُلَہُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَہُ"۔ آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

بے شک صبر کرنا ایک مشکل امر ہے، بے شک والد کی کمی دنیا کی کوئی چیز پوری نہیں کر سکتی، مگر مومن تو اللہ کی رضا میں راضی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت و حوصلہ عطا فرمائے، *کل نفس ذائقہ الموت* کے سائے میں خاکسار اور القلم اردو جہانیاں کے تمام اہلیان آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کے غم میں شریک ہیں اور آپ کے لیے دعا گو ہیں۔

والسلام

دعا گو

ثنا اکرم ملھی (جہانیاں)

29 جنوری، 2024ء

خط نمبر #2

ثنا اکرم ملہی

عزیزہ آپا منزہ!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! امید ہے آپ اللہ کی رحمت میں ہوں گی۔ خاکسار کو بے حد حزن ورنج پہنچا جب برقی مواصلات سے آپ کے سرتاج، شریکِ حیات کے انتقال کی خبر پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بلندیِ درجات ہو۔ انہوں نے تکلیف کے آخری ایام جو علالت میں گزارے ان پہ اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے اجرِ عظیم عطا فرمائے اور باعثِ مغفرت بنیں۔ خاکسار کی جانب سے اور پورے حلقہ القلم اردو جہانیاں کی جانب سے اظہارِ تعزیت قبول کیجیے۔
إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطَى وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پہ اپنی رحمت فرمائے اور ان کے تمام گناہوں پہ درگزر فرمائے "اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ"۔

ایک زوجہ کے لیے اپنے زوج کا انتقال بقا میں کھو کھلے وجود کے سوا نہیں ہوتا، بے شک یہ ایک سخت تکلیف و رنج کا وقت ہے جو آپ پہ گزرا۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ بے شک صبر کرنا ایک مشکل امر ہے، بے شک کی جانے والے کی کمی دنیا کی کوئی دوسری چیز پوری نہیں کر سکتی، مگر مومن تو اللہ کی رضا میں راضی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت و حوصلہ عطا فرمائے، *کل نفس ذائقہ الموت* کے سائے میں خاکسار اور القلم اردو جہانیاں کے تمام اہلیان آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کے غم میں شریک ہیں اور آپ کے لیے دعا گو ہیں۔

والسلام

دعا گو

ثنا اکرم ملہی (جہانیاں)

29 جنوری، 2024ء